اللہ والوں کی

مقبولیت کا راز

محمد سلمان منصور پوری
خادم مدرسہ شاہی مرادآباد

ناشر: مرکز نشر و تحقیق (مدنی منزل)، دیوبند

ملنے کا پتہ: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

• اشاعت کی عام اجازت ہے •

نام کتاب	اللہ والوں کی مقبولیت کا راز
ترتیب	محمد سلمان منصورپوری
ناشر	مرکز نشر وتحقیق (مدنی منزل) دیوبند
سرورق	عبدالرحمٰن ساجد الاعظمی
کتابت	عبدالناصر قاسمی لکھیم پوری، صدرالدین القاسمی الاعظمی
اشاعت اول	ذیقعدہ ۱۴۱۶ھ، مارچ ۱۹۹۶ء
دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن۔	ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
قیمت	۲۵، روپے۔

ملنے کا پتہ!

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تہدیہ

اللہ

کے مقبول بندوں کی

خدمت میں!

احب الصالحین ولست منہم

لعل اللہ یرزقنی صلاحا

مجھے نیک لوگوں سے محبت ہے، گو کہ میں

ان میں شامل نہیں ہوں۔

امید ہے کہ اللہ رب العزت مجھے

بھی نیکی سے سرفراز فرمائے گا۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہٗ

۲۶/۱۰/۱۴۱۷ھ

عرضِ مرتّب

حامداً ومصلیاً ومسلماً ۔ امابعد!

زیرِ نظر مضمون[1] کا اولین مخاطب خود یہ راقم الحروف ہے۔ احقر نے جب یہ محسوس کیا کہ اپنی زندگی کی ڈگر اللہ کے نیک بندوں کے راستہ سے ہٹتی جارہی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ لاپرواہی اور آخرت سے غفلت کا رجحان روزافزوں ہے۔ تو خیال آیا کہ اللہ والوں کی امتیازی صفات اور عبرت آموز واقعات یکجا کئے جائیں جو ہم جیسے کم ہمت لوگوں کے لئے مہمیز کا کام دیں۔ اور ان کو بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے سے دل میں کچھ غیرت پیدا ہو۔ اور غفلت اور کوتاہی کا تسلسل ٹوٹ سکے۔ اس لئے اپنی وسعت کے مطابق یہ چند بکھری ہوئی باتیں جمع کر دی ہیں۔ کاش یہ حقیر محنت بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل کرے اور اس ناکارہ اور سبھی قارئین کے لئے اصلاح اور دینی فائدہ کے حصول کا ذریعہ بنے۔ قارئین سے بھی استدعا ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے مقبول اور مقرب بندوں میں شامل فرمائے اور اپنی رضاء دائمی سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

فقط واللہ الموفق

احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ

خادم افتاء وتدریس مدرسہ شاہی مرادآباد

۱۷/۱۱/۱۷ھ

[1] یہ مضمون ندائے شاہی (جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی) مرادآباد کے متعدد شماروں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

تائید و دعا

اس مضمون کا ابتدائی حصہ احقر نے مخدوم گرامی عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی کی خدمت میں برائے ملاحظہ واصلاح پیش کیا تھا۔

حضرت والا نے انتہائی مصروفیات کے باوجود اس پر نظر فرمائی اور درج ذیل مکتوب سے مشرف فرمایا فجزاھم اللہ احسن الجزاء

عزیزم مفتی سلمان سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے مضامین کا مطالعہ کیا میرا ارادہ تھا کہ
اس قسم کے مضامین مرتب کر کے شائع کئے جائیں
کچھ کام بھی ہوا تھا مگر فرصت نہ ملنے کی وجہ سے
کام آگے نہ بڑھ سکا۔
اللہ پاک آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے
آپ کے اندر ماشاء اللہ صلاحیت ہے
مضامین بہت مفید ہیں ان میں
اضافہ کر کے جلد ہی شائع کرائیے
اللہ پاک اس کا بہتر اجر عطا فرمائے

سید صدیق احمد
خادم جامعہ عربیہ ہتورا باندہ
۵ رجب ۱۴۱۱ھ

افسوس کہ مورخہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ بروز جمعرات حضرت قاری صاحبؒ وصال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے بعض حالات آخر کتاب میں ملاحظہ کئے جائیں۔

فہرست

ضمیمہ: مقبول بارگاہ

حُسنِ نیّت :

دین کے ہر کام میں حسنِ نیّت ضروری ہے. نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: اِنّمَا الاَعمَال بالنیّات یعنی اعمال کے مقبول ہونے یا نہ ہونے کا مدار نیّت پر ہے، جیسی نیت ہوگی ویسے ہی اس پر اثرات مرتب ہونگے. حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے لاعمل لمَن لانیّة لہٗ، یعنی جس کی نیت صحیح نہیں ہے اس کے عمل کی کوئی حقیقت نہیں ہے. یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں "نیت کرنا سیکھو. اس لئے کہ یہ عمل کرنے سے زیادہ اہم ہے" داوٗد طائی فرماتے ہیں "کہ حسنِ نیت ہی تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے" حضرت سفیان ثوری نے ارشاد فرمایا کہ "میں اپنی نیّت سے زیادہ کسی چیز کی نگرانی نہیں کرتا کیونکہ وہ مسلسل الٹتی پلٹتی رہتی ہے"

یوسف ابن اسباط فرماتے ہیں، "نیت کو فاسد ہونے سے بچانا اہلِ عمل کیلئے لمبی لمبی عبادتوں سے بھاری ہے" اور حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے ارشاد فرمایا کہ "بہت سے معمولی اعمال نیّت کی صحت کی وجہ سے عظیم الشان ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات بہت بڑے بڑے اعمال نیّت کے فساد کی وجہ سے معمولی بنجاتے ہیں"

(جامع العلوم والحکم ۱۲)

رسوخ فی العلم کی چار نشانیاں

• علماء نے حقیقی عالم کی چار اہم صفات بیان فرمائی ہیں

• **التقویٰ فیمَا بینَه وَبینَ اللہِ تعالٰی**
اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تقویٰ کا معاملہ کرنا۔

• **التواضع فیمَا بینَه وَبینَ النّاسِ**
اپنے اور لوگوں کے درمیان تواضع اور انکساری کا معاملہ کرنا۔

• **الزّھد فیمَا بینَه وَبینَ الدّنیا**
اپنے اور دنیا کے درمیان بے رغبتی کا معاملہ کرنا۔

• **المجاھدة فیمَا بینَه وَبینَ نفسِه**
اپنے اور اپنے نفس کے درمیان مجاہدہ کا معاملہ کرنا۔ اور آرام طلبی کو چھوڑ دینا۔ (حاشیہ جمل علی الجلالین)

اشعث ابن شعبہ مصیصیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہارون رشید اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ "رقہ" میں مقیم تھے۔ اسی دوران خراسان سے امام وقت عبداللہ ابن المبارکؒ بھی "رقہ" میں رونق افروز ہوئے۔ ان کے استقبال کے لئے سارا شہر امڈ پڑا۔ بھیڑ کی کثرت کی وجہ سے راستے ٹوٹے ہوئے جوتوں اور چپلوں سے پٹ گئے اور پورے شہر کی فضا گرد آلود ہو گئی۔ ہارون رشید کی ایک باندی شاہی محل کے جھروکے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ آج خراسان کے ایک بڑے عالم عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنی تشریف آوری سے اس شہر کو رونق بخشی ہے، انکی زیارت واستقبال کے لئے یہ عظیم مجمع اکھٹا ہوا ہے۔ باندی یہ سن کر بے اختیار بول اٹھی: اللہ کی قسم یہ ہے بادشاہت! ہارون رشید کی بادشاہت حقیقی نہیں جس کے لئے فوج اور سپاہیوں کے ذریعہ مجمع لگایا جاتا ہے۔ (مقدمہ کتاب الزھد ص۵۵)

جن عبداللہ ابن المبارکؒ کا یہ واقعہ ہے ان کی عظمت ورفعت صرف عوام ہی کے دلوں میں نہ تھی بلکہ ان کے بارے میں بڑے بڑے ہمعصر علماء اور محدثینؒ نے ایسے شاندار کلمات ارشاد فرماتے ہیں، جو اسلامی تاریخ میں خال خال افراد ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔ سفیان ثوریؒ جیسے جلیل القدر محدث سے مروی ہے وہ کہتے تھے کہ میں پوری عمر اس آرزو میں رہا کہ کاش میری زندگی کا کوئی ایک سال عبداللہ ابن المبارکؒ کی طرح گذر جائے مگر میں تین روز بھی ان کی طرح گذارنے پر قادر نہ ہو سکا۔ امام نسائیؒ کا بیان ہے کہ ہمارے علم میں عبداللہ ابن المبارکؒ کے زمانہ میں کوئی ان سے زیادہ برتر، اور ان سے زیادہ اوصافِ حمیدہ کا جامع نہیں تھا۔ الغرض

علماء سلف وخلف ان کی جلالتِ شان پر متفق ہیں اور ہر شخص دل سے ان کا احترام کرتا نظر آتا ہے عبداللہ ابن المبارکؒ اور ان جیسے اپنے زمانہ کے مقبول ومحبوب علماء اور صلحاء کے حالات وواقعات دیکھ کر بعد کے لوگوں میں بھی یہ خواہش انگڑائی لیتی ہے کہ لوگ ان کا بھی اس طرح احترام کریں۔ جیسا عبداللہ ابن المبارکؒ وغیرہ کا کیا کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی جائیں استقبال کے لئے لوگوں کی بھیڑ امڈ پڑے۔ وہ جو بھی زبان سے نکال دیں وہ پتھر کی لکیر بن جائے اور ہر شخص دل سے ان کا مطیع اور تابع فرمان بن جائے۔ جب ابتداء ہی سے ہم اپنا ذہن یہ بنا لیتے ہیں تو جہاں بھی ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں رخنہ پڑتا ہے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ ہمارے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں سخت اذیت محسوس ہوتی ہے مگر ان "انفعالی کیفیات" کے باوجود ہم مقبولیت کے مقام سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کو پہلے ان صفات میں ڈھالا نہیں جن پر انسان کی مقبولیت کا مدار ہے۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح بغیر سہارے کے کسی بلند چھت پر چڑھنا محال ہے اسی طرح چند لازمی صفات اختیار کئے بغیر "مقامِ مقبولیت" کی "گرد" پانا بھی مشکل ہے۔

تواضع وانکساری

مقبولیت کی صفات میں سب سے اہم صفت تواضع وانکساری ہے۔ یعنی آدمی خود اپنی مقبولیت کا متمنی نہ رہے۔ اور دل سے اپنے آپ کو کمتر سمجھتا رہے اور شہرت کی غرض سے کوئی کام نہ کرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سربلندی اور عزت عطا فرماتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ۲/۴۳۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنے پیچھے صحابہ کی بھیڑ چلنا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم شدید گرمی کے دن بقیع کی طرف تشریف لے چلے لوگ آپ کے پیچھے چل رہے تھے۔ جب

آپؐ نے پیچھے جوتوں کی آواز سنی تو اسے اپنی توقیر کا ذریعہ سمجھا اور آپؐ فوراً بیٹھ گئے اور حضرات صحابہؓ کو آگے بڑھا دیا تاکہ آپؐ کے دل میں تکبر کا شائبہ نہ آجائے۔ (ابن ماجہ ۲۳)

خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے سے پہلے تک محلہ والوں کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ جب آپ خلیفہ بن گئے تو محلہ کی ایک بچی نے کہا کہ "اب ابو بکر ہمارے جانوروں کا دودھ کہاں نکالیں گے؟ حضرت ابو بکرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا، کیوں نہیں؟ میں اب بھی تمہارے لئے دودھ دوہا کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ میری نئی مصروفیت میرے کسی سابقہ اخلاق میں کوئی تبدیلی نہ کرے گی۔ چنانچہ آپ خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود محلہ والوں کے لئے دودھ دوہا کرتے تھے۔ (العلم والعلماءؒ ۱۴۶)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ آپ امیر المومنین ہونے کے باوجود اُون کا جبہ استعمال کرتے تھے جس میں چمڑے کے پیوند لگے ہوتے تھے اور اپنے کندھے پر کوڑا رکھے خود بازار میں گھومتے اور لوگوں کی (غلطیوں پر) سرزنش کرتے۔ اور اگر کہیں کھجور کی گٹھلیاں یا سوت وغیرہ پڑا ہوا ملتا تو اسے اٹھا لیتے اور کسی گھر میں ڈال دیتے تاکہ وہ گھر والے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ کو دیکھا کہ اپنے کندھے پر مشک اٹھائے جا رہے ہیں (لوگوں کے تعجب پر) آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے نفس کو ذلیل کرنے کے لئے ایسا کیا کیونکہ مجھے عُجب کا شبہ ہو گیا تھا۔ (العلم والعلماء صـ۱۶۳)

اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ میں نے خود سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے بائیں ہاتھ میں گوشت اور دائیں ہاتھ میں کوڑا اٹھائے ہوتے بازار سے گذر کر اپنے دولت خانہ تشریف لے گئے۔ (یعنی امیر المومنین ہونے کے باوجود ضرورت کی چیز ہاتھ میں لے کر چلنے میں کوئی عار محسوس نہ فرمائی) (احیاء العلوم ۲/۲۱۴)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

لہ یہ مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاً) کے مشہور عالم شیخ ابو بکر الجزائری کی تصنیف ہے۔

خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود مسجدِ نبوی میں بے تکلف آرام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب آپ وہاں سے اٹھتے تو صحن کی کنکریوں کے نشانات آپ کے بدن پر ہوتے تھے تو ہم ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے ــــ یہ ہیں امیر المومنین! یہ ہیں امیر المومنین (العلم والعلماء ۱۴۴)

امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بعض لوگوں نے دیکھا کہ آپ نے بازار سے گھر کے لئے گوشت خرید کر اپنی چادر میں رکھ لیا اور تشریف لے چلے۔ ساتھی نے کہا کہ لائیے! حضرت میں اسے اٹھا لوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ گرہستی والا ہی اسے اٹھا کر لے جانے کا زیادہ حقدار ہے۔ (احیاء العلوم ۲/۲۱۴)

ثابت البنانیؒ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدائن کے گورنر تھے تو ایک شامی شخص آیا جس کے پاس "بھس کا گٹھر" تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ادھر سے عجمی لباس پہنے ہوئے گذر رہے تھے۔ اس شخص نے آپ کو پکارا کہ میرا بوجھ ذرا لیکر چلو (اس نے سمجھا ہو گا کہ یہ کوئی مزدور ہے) حضرت سلمان فارسیؓ نے وہ سامان اٹھا لیا اور لے کر چلے۔ جب لوگوں نے آپ کو دیکھا اور پہچانا تو کہنے لگے۔ ارے یہ تو گورنر صاحب ہیں۔ اس شامی شخص نے بھی معذرت کی کہ حضرت! مجھے یہ پتہ نہیں تھا۔ مگر حضرت سلمانؓ نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے گھر تک سامان پہنچاؤں گا (العلم والعلماء ۲۴۱)

خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ سیدنا علی ابن الحسین زین العابدینؒ کی جب وفات ہوئی تو آپ کو غسل دینے والوں نے آپ کی کمر مبارک پر کالے کالے گٹے دیکھے تو گھر والوں سے پوچھا کہ یہ کیسے نشانات ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ان آٹے کے تھیلوں کے نشانات ہیں جنھیں حضرت زین العابدین رات کے وقت کمر پر لاد کر لیجاتے اور مدینہ منورہ کے فقیروں کو تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ (العلم والعلماء صـ۲۷۲)

خلیفۂ راشد سیدنا عمر ابن عبد العزیزؒ کے پاس ایک شخص رات میں مہمان ہوا۔ آپ چراغ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے تھے اتنے میں چراغ بجھنے لگا۔ مہمان نے کہا کہ لائیے

میں اسے ٹھیک کردوں (یعنی اس میں تیل وغیرہ ڈال دوں) حضرت عمر ابن عبد العزیز رح نے جواب دیا کہ مہمان سے خدمت لینا اچھی بات نہیں ہے۔ مہمان نے عرض کیا کہ حضرت پھر کسی غلام کو آواز دیں وہ چراغ درست کرلائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں وہ ابھی تو سویا ہے (اس کی نیند کچی ہے) پھر آپ خود اٹھے اور شیشی سے تیل نکال کر چراغ میں ڈالا (اور اسے درست کیا) مہمان نے تعجب سے کہا کہ اے امیر المومنین! آپ نے خود ہی یہ زحمت اٹھائی؟ اس پر حضرت عمر ابن عبد العزیز رح نے جواب دیا کہ جب میں گیا تو بھی عمر ہی تھا اور لوٹا تو بھی عمر ہی رہا۔ میرے اندر کوئی کمی تو نہیں ہوئی۔ اور سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو اللہ کے نزدیک متواضع ہو۔ (احیاء العلوم ۴/۲۱۴)

امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کی والدہ محترمہ کو کوئی مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی۔ امام صاحب رح نے مسئلہ کا حکم بتادیا تو آپ کی والدہ محترمہ نے امام صاحب رح کے فتوی کو قبول نہیں کیا۔ اور کہا کہ میں تو "زرعہ قاص" کے قول کو مانوں گی۔ چنانچہ حضرت امام صاحب رح اپنی والدہ محترمہ کو لے کر "زرعہ" کی خدمت میں تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ میری والدہ محترمہ آپ سے فلاں فلاں مسئلہ کے بارے میں فتوی لینے آئی ہیں۔ "حضرت زرعہ" نے فرمایا کہ آپ تو خود ہی سب سے بڑے عالم اور فقیہ ہیں آپ ہی بتادیں۔ تو امام صاحب رح نے فرمایا کہ میں نے تو انھیں یہ فتوی دے دیا ہے۔ حضرت "زرعہ" نے آپ کی والدہ ماجدہ سے کہا کہ مسئلہ وہی ہے جو امام ابو حنیفہ رح نے بتایا ہے۔ ان کی زبانی تائید سن کر والدہ محترمہ کو اطمینان ہوا۔ (عقود الجمان ۲۹۲)

اسی طرح امام صاحب رح عمر ابن ذر رح کی مجلس میں بھی والدہ محترمہ کو لے کر جاتے۔ وہ خود عمر ابن ذر رح سے مسئلہ معلوم کرتیں اور عمر ابن ذر رح امام صاحب رح سے حکم معلوم کر کے والدہ محترمہ کو مسئلہ بتایا کرتے تھے۔ (عقود الجمان ۲۹۲)

عبد اللہ ابن المبارک جب "مرو" میں رہتے تھے تو ایک بڑے مکان میں قیام پذیر تھے

جس کا صحن پچاس گز لمبا چوڑا تھا۔ اور روزانہ شہر کے بڑے بڑے علماء، امراء اور شیوخ آپ کے مکان پر جمع ہوتے اور آپ کے انتظار میں باہر بیٹھے رہتے اور جب آپ باہر تشریف لاتے تو ملاقات کا شرف حاصل کرتے تھے۔ مگر جب آپ کوفہ پہنچے تو وہاں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا اور نماز کے اوقات کے سوا آپ مکان سے باہر تشریف نہ لاتے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا کہ "اب آپ کو تنہائی سے وحشت نہیں ہوتی (کہ "مرو" میں اتنی خلقت کے درمیان آپ رہتے تھے اور یہاں بالکل تنہا ہیں؟) تو آپ نے یہ سن کر ایسا جواب دیا جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "مرو" کی جس چیز کو تم پسندیدہ سمجھ رہے ہو، اسی سے بھاگ کر میں یہاں آیا ہوں اور یہ تنہائی جسے تم ناپسندیدہ سمجھ رہے ہو یہی مجھے مرغوب ہے۔ جب میں "مرو" میں تھا تو جو بھی معاملہ پیش آتا میرے ذمہ کر دیا جاتا اور جو بھی مسئلہ کھڑا ہوتا یہ کہا جاتا کہ "ابن مبارک سے پوچھ لو" آج مجھے ان سب جھمیلوں سے نجات ملی ہوئی ہے۔

کوفہ کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ آپ پانی پینے کے لئے سقایہ پر تشریف لے گئے وہاں لوگ جمع تھے۔ آپ پانی پینے کے لئے آگے بڑھے لوگوں نے آپ کو نہ پہچانا جس کی وجہ سے آپ کو بھی لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے "دھکا مکی" کی زحمت اٹھانی پڑی۔ جب آپ وہاں سے باہر نکل کر آتے تو فرمایا یہی اصل زندگی ہے! جس میں نہ پہچانے جائیں، نہ عزت کی جاتے۔ ایک مرتبہ نضر ابن محمد رح نے اپنے بیٹے کے ولیمہ میں آپ کو دعوت دی تو آپ تشریف لے گئے اور جا کر لوگوں کو کھانا کھلانے والوں میں شامل ہو گئے۔ نضر ابن محمد رح یہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور منت سماجت کر کے وہاں سے آپ کو لا کر الگ بٹھایا (مقدمہ کتاب الزہد ۴۳،۴۴،۴۶،۱۴)

حضرت عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایندھن کا ایک گٹھر اٹھاتے اپنے باغیچہ سے باہر نکلے لوگ انھیں دیکھ کر بولے! کہ حضرت! آپ یہ کام اپنے کسی لڑکے یا غلام سے لے لیتے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے دل کو آزما رہا ہوں کہ یہ عمل مجھے برا تو نہیں

لگتا (یعنی اگر نفس پر شاق ہوگا تو تواضع کے خلاف ہوگا) (کتاب الزہد ۲۸۷)

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان اس وقت تک ایمان کے کمال کو حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے نزدیک تواضع شرافت سے زیادہ افضل اور پسندیدہ نہ ہوجائے اور تھوڑی دنیا زیادہ مال کے مقابلہ میں اسے عزیز نہ ہوجائے۔ اور حق بات میں اس سے محبت یا بغض رکھنے والے دونوں اس کی نظر میں برابر نہ ہوجائیں اور وہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی اسی طرح فیصلہ کرے جیسے اپنے اور اپنے گھر والوں کے حق میں کرتا ہے۔ (کتابُ الزھد بروایۃ نعیم ص۵۲)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اے لوگو! تم افضل ترین عبادت یعنی تواضع سے لاپرواہی برت رہے ہو۔ (کتاب الزھد ص۱۳۲) عمر ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ میں لوگوں کے سامنے زیادہ گفتگو نہیں کرتا مبادا میں فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہوجاؤں۔ (کتابُ الزھد ص۴۴) حضرت امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تواضع لوگوں کے دلوں میں محبت کی تخم ریزی کرتی ہے۔ اور قناعت سچی راحت عطا کرنے کا ذریعہ ہے۔ (العلم والعُلماء ص۲۲۲) ابوحازم کہتے ہیں کہ جب تک تین۳ باتیں کسی میں نہ پائی جائیں وہ عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ (۱) اپنے سے بڑے سے بغاوت نہ کرے۔ (۲) اپنے سے چھوٹے کو حقیر نہ سمجھے۔ (۳) اپنے علم پر کسی سے معاوضہ کا طالب نہ رہے۔ (العلم والعُلماء ص۲۶۵)

الغرض یہ تواضع اور انکساری اور شہرت پسندی سے اجتناب ایسی عظیم صفت ہے جو انسان کو واقعۃً عنداللہ اور عندالناس محبوب اور مقبول بنادیتی ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو حضرات بھی اپنے زمانہ میں مقبول و محبوب رہے ہیں اور جنھوں نے بھی فقر میں رہ کر خلق خدا کے دلوں پر حکمرانی کی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی تواضع سے متصف تھے۔ خاص کر حضرات اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ ان کی

ہر ہر ادا سے عجز و فروتنی اور تواضع و انکساری کا اظہار ہوتا تھا۔ اس ضمن میں اگر ان حضرات کے واقعات یکجا کئے جائیں تو اچھا خاصا مواد تیار ہوسکتا ہے۔ اسی صفت نے ان بزرگوں کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھادیا تھا۔ اور عوام و خواص سب ان کے گرویدہ اور دل و جان سے مطیع ہوگئے تھے۔ اور آج بھی جب ان کا نام سامنے آتا ہے تو گردنیں ان کے احترام سے جھک جاتی ہیں۔

ہمارا حال

مگر افسوس ہے کہ آج ان ہی بزرگوں کے اخلاف اور ہم جیسے کندۂ ناتراش جو چاہتے تو یہ ہیں کہ ہمیں بھی وہی مقبولیت ملے جو کسی زمانہ میں عبداللہ ابن المبارکؒ اور اکابرین کو حاصل تھی مگر ہماری زندگی تواضع کی حقیقت سے خالی ہے۔ آج ہم زبانی طور پر اپنے کو متواضع، کمترین نالائق، احقر، حقیر اور فقیر وغیرہ کہتے نہیں تھکتے مگر دماغ میں خودنمائی اور خودپسندی کا سودا سمایا رہتا ہے۔ اپنی تعریف سن سن کر جی بڑا خوش ہوتا ہے۔ اور اعتراض کے شائبہ سے بھی دماغ کھولنے لگتا ہے۔ ہم ہر وہ ہیئت اختیار کرنا پسند کرتے ہیں جس سے ہماری عظمت کا اظہار ہو۔ اور ہر اس صورت سے بچتے ہیں جس سے ہم دل میں خفت محسوس کریں۔ لوگوں کے سامنے کتابیں یا اپنے سودے کا تھیلا لے کر چلنے میں ہمیں شرم آتی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہماری عزت میں فرق آجائے گا۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کو دفع کرنے کا یہ طریقہ بھی بتلایا ہے کہ آدمی اپنے گھر کا سامان خود اٹھا کر لایا کرے۔ (احیاء العلوم ۲۰۶/۳) چنانچہ میں نے اپنے بعض اساتذہ کو دیکھا کہ وہ روزانہ اپنے گھر کا سودا سلف خود اٹھا کر لاتے تھے۔ اور کوئی شاگرد تھیلا لے کر ساتھ چلنے کی کوشش کرتا بھی تو منع فرمادیتے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام کاج میں شریک رہتے۔ ضرورت پڑتی تو بکری کا دودھ بھی اپنے دستِ مبارک سے دوہ لیتے۔ گدھے کی سواری کو بھی باعثِ عار نہ سمجھتے،

اور مہمان کی خود ہی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔ (مجمع الزوائد ۹/۲۰)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ جب مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں درس دیتے تھے اور اس وقت آپ کا درس نہایت مقبول تھا۔ اسی دور میں درس سے فارغ ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے والد محترم اور بھائیوں کے ساتھ اپنے گھر کی تعمیر کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ حالانکہ اگر آپ ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے تو آپ کے سب شاگرد سعادت سمجھ کر اس خدمت کو انجام دیتے مگر آپؒ نے اس کو گوارا نہ فرمایا اور خود اپنی ضرورتیں پوری فرمائیں۔

وعظ کی مجلسیں کیوں مؤثر نہیں؟

اسی طرح آج جب ہم کہیں تقریر کے لئے بلائے جاتے ہیں تو پہلے ہی سے ہماری یہ تمنا رہتی ہے کہ ہمارا نام سن کر جلسہ میں بڑا مجمع آئے اور تقریر ایسی ہو جو تاریخی یادگار بن کر زبان زد خاص و عام ہو جائے اور جلسہ والے اگر خاطر خواہ ظاہری اور باطنی (لفافہ کی شکل میں) آؤ بھگت نہ کریں تو ہمیں شدید کوفت ہوتی ہے۔ کبھی ہم اس کا برملا زبان سے اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ نہیں تو یہ طے کر لیتے ہیں کہ اب آئندہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔ اور اگر ہم مدعو ہوں مگر وقت کی تنگی اور مقرروں کی کثرت کی وجہ سے ہمیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہ ملے تو ہمارے غصہ کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہمیں اپنے فن پر اتنا ناز ہوتا ہے ہم جلسہ میں کسی دوسرے مقرر کی تقریر خوش دلی سے سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ دل چاہتا ہے کہ جلدی سے اس کی تقریر ختم ہو یا ختم کرائی جائے اور ہمارا نمبر آئے تاکہ اگلی پچھلی کسر نکالی جا سکے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو سب سے اچھا مقرر، اور گفتگو کا سب سے اچھا اہل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نہایت خطرناک بات ہے۔

زید ابن حبیبؒ فرماتے تھے کہ عالم اور فقیہ کے لئے یہ بڑا فتنہ ہے کہ وہ دوسرے

کی گفتگو سننے کے مقابلہ میں اپنی بات کہنا زیادہ پسند کرتا ہو باوجودیکہ وہ ایسے کو پاتے جو اس کی طرف سے گفتگو کی کفایت کر سکے (یعنی دوسرے اہل شخص کی موجودگی میں بھی اپنی بات کہنا ضروری خیال کرے تاکہ لوگ اس کے علم کے قائل ہو سکیں) (کتاب الزہد ۱۶)

نصر بن حاجبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ "عمر ابن ذرؒ" کی تقریر سننے تشریف لیجاتے اور اس میں کوئی عار نہ محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ آپ تقریر اور وعظ غور سے سن رہے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ (عقود الجمان ۲۲۹)

آج ہمیں دوسرے واعظ کو سننے کی فرصت ہی کہاں؟ یہاں تو یہ ادھیڑ بن رہتی ہے کہ کیا ایسی بات کہی جائے کہ اپنے سے پہلے مقرر کا سارا اثر جاتا رہے۔ ایک عقلمند کا قول ہے کہ جب کوئی شخص کسی جلسہ میں گفتگو کرے اور اسے اپنی تقریر اچھی لگے اور وہ عجب میں مبتلا ہو جائے تو اسے فوراً خاموش ہو جانا چاہیئے۔ اور جب کوئی شخص کسی ایسی مجلس میں ہو جہاں خاموش رہنا باعثِ عجب ہو تو اسے کچھ گفتگو کر لینی چاہیئے۔ (کتاب الزہد ۶۷) ہمارے اکابر کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ تقریر کرتے کرتے جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ یہ بات ہماری بڑائی کا ذریعہ بنے گی تو فوراً بات ختم کر دی اور بیٹھ گئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جن کا علمی اور روحانی فیض آج چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی دعوت پر کانپور تشریف لے گئے اور بہت اصرار کے بعد علماء کی ایک مجلس میں وعظ کہنا شروع کیا علمی ماحول میں حضرت کی طبیعت خوب کھلی ہوئی تھی اور مضامین عالیہ بیان ہو رہے تھے اتنے میں ایک شخص (مائل بہ بدعت) عالم مولانا لطف اللہ علی گڈھی مجلس میں آ گئے۔ ان کے دیکھتے ہی حضرت شیخ الہندؒ نے اچانک تقریر ختم فرما دی اور بیٹھ گئے۔ بعد میں مولانا فخر الحسن صاحبؒ نے پوچھا کہ حضرت! اچانک وعظ کیوں ختم فرما دیا تھا ـــ آپ کا جواب تھا: کہ جب مولوی لطف اللہ صاحب آئے تو مجھ کو خیال ہوا کہ اب مضامین بیان کرنے کا وقت ہے۔ یہ بھی دیکھیں گے کہ علم

کیا چیز ہے تو اس طرح وعظ میں خلوص نہ رہا اس لئے قطع کر دیا گیا۔ (ارواحِ ثلاثہ ص۴۰)

اللہ اکبر! یہ ہے اخلاص! ذرا سوچیں آج اگر ہمیں ایسے مجامع میں بیان کرنے کا موقع ملے تو ہم چھانٹ کر ایسی باتیں لاتے ہیں جو کسی کے وہم وخیال میں بھی نہ ہوں تا کہ حاضرین عش عش کر اٹھیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

اسی طرح ان حضرات نے کبھی یہ اہتمام نہیں کیا کہ ان کی مجلس میں بڑا مجمع آئے بلکہ جب اور جہاں فائدہ دیکھا تو چند لوگوں میں بھی اسی انشراح کے ساتھ بیانات فرمائے جیسے بڑے بڑے جلسوں میں کئے جاتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مواعظ دیکھئے حیرت ہوتی ہے کہ صرف ۲۰/۲۵ آدمی سامنے بیٹھے ہیں اور آپ کئی کئی گھنٹے بلا تکان علوم ومعارف کے پھول برسا رہے ہیں۔ اور ہم اپنی حالت یہ دیکھتے ہیں کہ جب تک بھرا پرا جلسہ نہ ہو ہماری طبیعت ہی نہیں چلتی بلکہ بھیڑ کی کمی کی وجہ سے آیا ہوا مضمون بھی خبط ہو جاتا ہے۔ گویا ہم جلسوں کو اشاعتِ دین نہیں بلکہ اپنی شہرت کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہمارا مقصود اشاعتِ دین ہوتا تو ہم دو چار آدمیوں میں بھی دین کی بات پہنچانے میں ہرگز نہ جھجکتے جب کہ یہ تجربہ ہے کہ جو فائدہ بسا اوقات مختصر مجامع میں بیانات سے ہوتا ہے وہ عظیم الشان جلسوں سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر ہماری نیت میں خلوص ہوتا تو کسی دوسرے مقرر کی تقریر سے ہمیں قطعاً کوفت نہ ہوتی اور ہم سمجھ لیتے کہ مقصود اس سے بھی حاصل ہو رہا ہے بلکہ اور خوش ہوتے کہ ہماری ذمہ داری اس نے ادا کر دی۔

اپنے دور کے خطیبِ اعظم حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک جلسہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں پہلے مولانا محمد علی جالندھری کی تقریر ہوئی ان کی تقریر کے دوران شاہ صاحب واہ واہ اور سبحان اللہ کہتے رہے اور جب شاہ صاحب کا نمبر آیا تو یہ فرما کر جلسہ برخاست کر دیا کہ مولانا کی تقریر کے بعد اب میری ضرورت نہیں رہی۔ حالانکہ شاہ صاحبؒ ہی کے نام پر مجمع اکٹھا ہوا تھا (بتیس بڑے مسلمان) یہ ہے واقعی اخلاص کی نشانی۔

مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا معمول تھا کہ اپنی علمی جلالت کے باوجود کسی بھی واعظ کی تقریر سننے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے بلکہ وقت نکال کر کچھ نہ کچھ دیر کے لئے وعظ ضرور سنتے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے وعظ میں کوئی نئی بات معلوم ہو جائے یا عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ (دیکھئے میرے والد میرے شیخ۔ از مولانا محمد تقی عثمانی ۱۹۴)

مقبول کون؟

ہم اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ عمدہ عمدہ نادر ونایاب مضامین لسانی اور چرب زبانی، اور اپنی تقریروں میں لطائف وظرائف کا انبار لگا کر ہم مقبولیت کا مقام حاصل کر لیں گے اور اپنی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھا لیں گے؟ حالانکہ یہ سراسر فریب ہے، ہو سکتا ہے کہ ہم اس تماشہ سے وقتی طور پر لوگوں کو داد دینے پر مجبور کر دیں۔ مگر مقبولیت کا راز صرف عنداللہ مقبولیت ہی میں مضمر ہے۔ حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں "کہ دنیا میں کسی شخص کی تعریف اسوقت تک لوگوں کے دلوں میں نہیں اترتی جب تک کہ آسمان والوں میں اس کی تعریف کا چرچا نہ ہو جائے۔ (کتاب الزھد ۱۵۳) اور آسمان والوں میں تعریف اسی شخص کی ہو سکتی ہے جو تواضع اور اخلاص وللّٰہیت کی عظیم صفات سے مزین ہو، ریا ونمود کے جذبہ سے کہے جانے والے شاندار مضامین سامعین کے سروں پر سے گذر جاتے ہیں جب کہ اخلاص سے کہی جانے والی ٹوٹی پھوٹی باتیں دل کی گہرائیوں میں جگہ پا جاتی ہیں۔

امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جن کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ سبق کے دوران بارش آجانے پر طلبہ کے جوتے تک اٹھالئے اور ذرہ برابر عار محسوس نہ فرمائی۔ (ارواح ثلاثہ ۳۲۱) جب آپ وعظ فرماتے تو نہایت سادگی کے باوجود حاضرین کی حالت یکسر بدل جاتی۔ اور لمبی چوڑی لچھے دار تقریروں سے جو اثر نہیں ہو سکتا وہ آپ کے ارشاد فرمودہ چند جملوں سے ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ دار العلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں لوگوں کے شدید اصرار

پر آپ نے وعظ فرمایا۔ وعظ کے دوران مجمع کا کیا حال تھا۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں

"وعظ کیا تھا؟ وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا کا مصداق تھا! اور بیان کیا تھا؟ محبتِ الٰہی کا دریائے مواج اور قلزم متلاطم تھا جس نے اِس کنارے سے لے کر اُس کنارے تک ہر صغیر و کبیر کی حالت کو دگرگوں کر دیا تھا۔ آپؒ حدیث کی کتاب لے کر منبر پر بیٹھے اور کیف ما اتفق اس کو کھول کر جو حدیث نظر پڑی۔ اس کو پڑھ کر ترجمہ فرمانے لگے۔ آپ کے سارے وعظ میں حدیثِ نبوی کا سادہ ترجمہ اور یہی نماز روزہ کے مسائل تھے جو معمولی پڑھے لکھے بھی بیان کر دیتے ہیں مگر خدا جانے وہ غیبی تاثیر کیا تھی! جس نے سارے جلسہ کو ساکت و صامت اور مبہوت و سرنگوں بنا رکھا تھا۔ ہر شخص اس قلبی فیضان سے متاثر تھا۔ اور مسجد کی دیواریں تک مست و سرشار نظر آتی تھیں۔ حضرت مولانا المولوی رفیع الدین صاحبؒ مہتمم مدرسہ نے اس وعظ کی چشم دید کو سالانہ روئیداد میں مختصر الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"کہ وعظ کیا تھا؟ گویا سامعین کو مئے محبت الٰہی کے خم کے خم پلا دیئے در و دیوار تک مست تھے اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ اللہ اللہ اس کے خاص بندوں کے سیدھے سادے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کیا شجر و حجر بھی مان جاتے۔ مولانا نے کوئی دقیق مضامین علمیہ بیان نہیں کئے۔ یہی نماز اور وضو کے مسائل بیان کئے اور اخلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ بآواز بلند "اللہ" کہا۔ معلوم نہیں کہ کس دل اور کیسے سوز و گداز سے "اللہ" کا نام لیا کہ تمام مجلس وعظ لوٹ گئی۔ اور آہ و زاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا۔ اسوقت

بعض اشخاص نے مولوی صاحب کو دیکھا کہ کمالِ وقار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں اور اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہیں۔ یقین ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ایسے متوجہ نہ ہوتے تو اہلِ مجلس کو دیر تک افاقہ نہ ہوتا مگر اللہ رے حوصلہ کہ خود ویسے ہی مستقل رہے۔ ع سینہ میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ ہی رہا۔

مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ آگے لکھتے ہیں:

"اس جلسہ کا حظ وافر انہیں سے پوچھنا چاہیئے جن کی خوش نصیب آنکھوں نے یہ حیرت خیز سماں دیکھا اور درد انگیز وعظ سنا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت امام ربّانی نے جس وقت حق جل شانہٗ کا نام مبارک لیا ہے چھوٹا بڑا ہر شخص اس سے متاثر تھا۔ اکثر پر رقت طاری تھی اور گریہ و بکا کا ہجوم تھا کہ بے اختیار تڑپنا چاہتے بلکہ بعض تڑپتے اور لوٹتے تھے۔ قلب پر کیفیت سب کے طاری تھی اور سبب کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس مضمون پر یہ بے اختیاری ہویدا ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ وعظ سے قبل مجمع میں واعظین کی تقاریر اور تاثرات کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ بعض وعظ کہنے والے بیان و تقریر کا اس درجہ ملکہ رکھتے ہیں کہ حاضرین کا ہنسا دینا اور رُلا دینا گویا ان کے اختیار میں ہے کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جس وقت رنگ بدلنا چاہا رُلا دیا۔ حضرت امام ربانیؒ نے بھی یہ گفت گو سنی اور بات ٹالنے کے لئے یوں ارشاد فرما کر خاموش ہو گئے کہ "اللہ کے بندوں کے نزدیک یہ کوئی چیز نہیں گنی جاتی۔ رُلانا اور ہنسانا بات ہی کیا ہے اخلاص کے ساتھ اللہ کا نام بھی نکلے تو اس پر مخلوق رونے لگے" چنانچہ چند ہی ساعات کے بعد وعظ میں وہ مضمون جو علم الیقین تھا عین الیقین بن گیا۔ اور کئی ہزار مخلوق نے اخلاص و صدق کی ماہیت اور کیفیت سے آگاہی حاصل

کرلی۔ (تذکرۃ الرشید ۲۵۰-۲۵۱)

وعظ و نصیحت کی یہ غیر معمولی تاثیر حقیقی تواضع اور اخلاص کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا مقولہ ہے کہ "دل سے نکلنے والی بات ہی دل کو نفع پہنچاتی ہے" (العلم والعلماء ۲۸۳) آج ہماری تقریروں اور مواعظ کے بے اثر ہونے کی ایک وجہ یہی ہے کہ ہم میں سچی مقبولیت کی یہ دونوں صفتیں (اخلاص اور تواضع) عنقا ہوتی چلی جارہی ہیں اور شہرت پسندی، دوسرے پر برتری اور دنیوی مفادات کی حرص جیسی خرابیوں نے ہمارے طبقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کاش ہمیں ان خرابیوں کا احساس ہوسکے۔

سچی مقبولیت کی پہچان

ہمارے مواعظ اور بیانات اگر عوام کو پسند آنے لگیں اور ہمیں بار بار جلسوں میں بلایا جانے لگے اور لوگ آکر خوشامد کرنے لگیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول ہوگئے ہیں حالانکہ یہ "سطحی عوامی مقبولیت" اللہ رب العزت کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں ہے۔ دنیا میں اس سے کہیں زیادہ عوامی مقبولیت ڈائیلاگ دکھانے والے فلمی اداکاروں اور کھلاڑیوں کی ہوتی ہے مقبولیت وہی معتبر اور مبارک ہے جو پہلے اللہ کے نیک بندوں کی زبانوں اور دلوں میں پیدا ہوا اور ان کے بعد عوام تک پہنچے۔ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے تھے کہ "قبول عام کی ۲ صورتیں ہیں۔ ایک وہ قبول جو خواص سے لیکر عوام تک پہنچے۔ اور دوسرا وہ جو عوام سے شروع ہو اور اس کا اثر خواص تک بھی پہنچ جائے۔ پہلا قبول علامتِ مقبولیت ہے نہ کہ دوسرا۔ کیوں کہ حدیث میں جو مضمون علامتِ مقبولیت کا آیا ہے وہ یہ ہے کہ اول بندہ سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں پھر وہ ملاء اعلیٰ کو محبت کا حکم دیتے ہیں۔ اور ملاء اعلیٰ اپنے سے نیچے والوں کو، یہاں تک وہ حکم اہل دنیا تک آتا ہے۔ اور جو ترتیب ملاء اعلیٰ میں تھی اسی ترتیب سے اس کی محبت دنیا میں پھیلتی ہے۔ کہ پہلے اس سے اچھے لوگوں کو محبت ہوتی ہے۔ اس کے بعد دوسروں کو پس جو مقبولیت

اس کے برعکس ہوگی وہ دلیلِ مقبولیت نہ ہوگی (ارواح ثلثہ ص ۱۵۱) اس لئے ہمیں محض عوامی واہ واہ سے دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیئے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ خبردار! تم میں سے کسی کو اپنے اردگرد جمع ہونے والی بھیڑ فریب میں مبتلا نہ کرے (کتاب الزہد ۲۹۲) یعنی یہ چیز مقبولیت کی دلیل نہیں ہے۔ ایسے موقع پر اگر نفس میں بڑائی کا خیال بھی آئے تو یہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ بے چارے عوام اگر ہمارے علم کے معترف ہیں تو اس کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ذرا سا دماغ چلا دے تو ساری علمی موشگافیاں دھری کی دھری رہ جائیں۔ اور اگر یہ لوگ ہماری چرب زبانی اور لسّانی کے قائل ہیں تو بحکم خداوندی تو اگر یہ زبان لقوہ کی زد میں آجائے تو سارا بھرم ہی جاتا رہا۔ یہی معاملہ اور دوسرے کمالات کا ہے جن پر انسان عجب اور غرور میں مبتلا رہتا ہے۔ ان کے وجود اور بقاء کا مدار صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے منشاء اور مرضی پر ہے۔ تو ان پر حقیقی تعریف کے کیا معنیٰ! یہ تو سب محض فضلِ خداوندی ہے جس پر اترانے اور غرور کرنے کی اجازت نہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بارہا قسم کھاکر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتّٰی کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فسّاق و فجّار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی احتمالاً فی الحال افضل نہیں سمجھتا۔ اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ (حکیم الامتؒ کے حیرت انگیز واقعات ۷۶)

اور ایک موقع پر حضرتؒ نے ارشاد فرمایا: کہ مجھ میں تو سَراسر عیوب ہی عیوب بھرے پڑے ہیں میری اگر کوئی برائی کرتا ہے تو یقین جانئے مجھے کبھی بھی وسوسہ نہیں ہوتا کہ میں برائی کا مستحق نہیں۔ بلکہ اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو واللہ تعجب ہوتا ہے کہ مجھ میں بھلا کون سی تعریف کے لائق بات ہے جو اس کا یہ خیال ہے۔ اس کو دھوکہ ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے ستّاری کی ہے کہ میرے عیوب کو پوشیدہ رکھا ہے۔ اس لئے مجھے کسی کا برا کہنا مطلق ناگوار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی میری ایک تعریف کرتا ہے تو اسی وقت دس عیب سامنے آجاتے ہیں۔ برا بھلا کہنے والے کو عدمِ واقفیت

کی وجہ سے معذور سمجھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میری وجہ سے اپنی کسی مخلوق پر مؤاخذہ نہ کیجئو۔ جو کچھ کسی نے میرے ساتھ برائی کی ہو یا آئندہ کرے وہ سب میں نے دل سے معاف کی۔ اگر میری وجہ سے کسی کو عذاب ہوگا تو اس سے مجھے کیا فائدہ؟

(حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات ۸۲)

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ کی مجلس میں علماء کے کبر و تواضع پر بحث ہو رہی تھی، کہ ایک عالم آخر کیسے اپنے آپ کو جاہل سے کمتر سمجھ سکتا ہے؟ کیونکہ جب اس نے علم پڑھا ہے تو یہ کیسے سمجھے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تو حضرت حکیم الامتؒ نے نہایت جامع جواب ارشاد فرمایا کہ: کسی کمال کے سبب اکمل سمجھنا تو جائز ہے لیکن افضل بمعنی مقبول سمجھنا جائز نہیں۔ پس یہ سمجھنا کہ میں عالم ہوں کوئی حرج نہیں مگر اس پر اپنے آپ کو مقبول عند اللہ سمجھنا یہ بڑا خطرناک ہے۔ بس یہ سمجھے کہ ممکن ہے کہ باوجود اس کے جاہل ہونے کے اس میں کوئی ایسی خوبی ہو جس سے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے اور ہم گو بڑے عالم ہوں مگر ہم میں کوئی ایسی برائی ہو جس سے ہم ان کو پسند نہ آئیں پھر ہم کس کام کے؟ (حوالہ بالا ۹۰)

ایک موقع پر حضرت حکیم الامتؒ نے یہ قیمتی مضمون ارشاد فرمایا کہ: بڑا بننے کا طریقہ یہی ہے کہ چھوٹا بنے پھر خود بخود اس میں اثر ہے کہ بڑا بن جاتے گا۔ اسی واسطے سلاطین اور مشائخ کی ہزاروں حکایتیں ہیں کہ انہوں نے تواضع اختیار کی اس سے ان کو بڑائی حاصل ہوئی (حوالہ بالا ۱۰۹)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ ایک مرتبہ قصبہ سیوہارہ میں تشریف لے گئے وہاں کی شاہی مسجد میں جمعہ کے بعد حضرت کی تقریر کا پروگرام تھا۔ تقریر سے قبل ایک صاحب نے آپ کی شان میں ایک نظم پڑھنی شروع کی۔ ابھی چند ہی اشعار ہوئے تھے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ یکلخت کھڑے ہوگئے اور ان صاحب کو نظم پڑھنے سے روک دیا اور تقریر شروع فرمادی۔ اور آیات واحادیث طیبہ کی روشنی میں خود ستائی، شخصیت پرستی اور منہ پر تعریف کرنے کی کھل کر مذمت فرمائی اور دوران تقریر یہ ارشاد فرمایا "کہ میں کسی سے اپنی

تعریف سنتا ہوں تو سخت رنج ہوتا ہے کہ لوگ اسوۂ نبیؐ اور سیرت صحابہؓ کو بھول گئے۔ وہاں نیت میں خلوص تھا۔ یہاں تعریف ہے۔ وہاں عمل تھا یہاں صرف قول اور مدح وستائش ہے۔ (حیرت انگیز واقعات ۸۷)

حضرت مدنیؒ کی زندگی کا یہ کوئی ایک واقعہ نہیں بلکہ اس دور میں جبکہ قائدین ملت باقاعدہ اپنے استقبال کے خود کوشاں رہتے تھے۔ اور قومی اجتماعات میں اپنے لیڈروں کے لئے منقبتی نظمیں پڑھنے کا رواج عام تھا۔ حضرت مدنیؒ اپنی تعریف پر غصہ میں آجاتے اور اس عمل پر سخت ناگواری کا اظہار فرماتے تھے۔ آپ پوری زندگی اپنے کو نہ صرف ننگ اسلاف لکھتے رہے بلکہ دل کی گہرائیوں سے آپ اس پر یقین بھی کرتے رہے۔ درحقیقت اسی تواضع اور انکساری نے آپ کو محبوب خلائق بنادیا تھا۔ اور آپ سے سیاسی اختلاف رکھنے والے لوگ بھی آپ کے بلند اخلاق کے گرویدہ اور معترف تھے۔

فقیہ الامت حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ واقعی اس آخری دور میں اکابر کی نسبتوں کے جامع، مرجع خواص وعوام تھے۔ اور آج جن کا فیض محسوس طور پر پورے برصغیر میں پھیلا ہوا ہے۔ اس بے مثال مقبولیت میں آپ کی عظیم تواضع و فنائیت کا بھی بڑا دخل تھا۔ علمی اور فقہی جلالت شان کے باوجود آپ کی کسی نقل و حرکت سے کبر کا شائبہ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ آپ کی مجلس میں بلا امتیاز ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی اور آپ ہر شخص سے ایک ہی انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔ کسی مسئلہ کے بارے میں اگر علم نہ ہوتا تو بلا تکلف فرمادیتے کہ مجھے علم نہیں۔ مجھے تحقیق نہیں۔ تعریف اور مدح سرائی سے آپ کو سخت اذیت ہوتی۔ اور گمنامی اور گوشہ نشینی کو پسند فرماتے تھے۔ دنیا نے دیکھا کہ جتنا آپ نے اپنے آپ کو فنا کیا اتنا ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سربلندی اور عزت واحترام سے سرفراز کیا۔ اور بڑے بڑے علماء، دانشور، اور ارباب ثروت کی گردنیں آپ کے اعزاز میں خم ہوگئیں۔

تصنیفات کے بارے میں اکابر کا طرزِ عمل

اللہ والوں کی تواضع کا اثر ان کی تصنیفات و تالیفات

میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ حضرات اپنی تحریرات کو ریا، ونمود اور عزت و افتخار کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ صرف دینی نفع اور علمی افادہ کے پیشِ نظر تصنیفی خدمات انجام دیتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر اور مضامین پر تعریف کے متمنی نہیں رہتے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دین کے لئے کتنا مفید بنانے کی توفیق دی ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص انکی تصانیف پر معقول انداز میں کوئی اشکال کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف مخالفت کا طوفان کھڑا نہیں کرتے بلکہ یا تو معترض کو مطمئن کرتے ہیں یا اپنی غلطی تسلیم کر کے مضمون کی تصحیح کرتے ہیں اور کسی مصنف کا برسرِ عام اپنی غلطی سے رجوع کر لینا واقعی اس کی غایت تواضع اور کمالِ علم کی دلیل تسلیم کی جاتی ہے۔ حکیم الامتؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ترجیح الراجح کے عنوان سے اپنے بے شمار مضامین اور فتاویٰ سے علی الاعلان رجوع فرمایا۔ اور اس میں کبھی اپنی عار محسوس نہ فرمائی۔ ہمیں بھی اس معاملہ میں انہی مقبول بندگانِ خدا کا اسوہ اپنانا چاہیئے۔ موجودہ دور کے مشہور و معروف عالم اور محقق حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم و مدت فیوضہم اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کو اپنے کسی علمی کارنامے پر کوئی ناز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اپنی بڑی سے بڑی خدمت کو ہیچ سمجھتے رہے۔ انسان کو عام طور سے اپنی تحریروں اور اپنے لکھے ہوئے مضامین سے ایک انس پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ مصنفین میں عام طور سے یہ شوق پایا جاتا ہے کہ ان کی تالیفات کا تذکرہ کیا جائے۔ انھیں سراہا جائے۔ بہت سے مصنفین کی محفلیں اپنی تصانیف ہی کے ذکر اور ان کی تعریفوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ بعض لوگ

جا بجا اپنی تالیفات کے حوالے دے کر ان کے اقتباسات لوگوں کو سناتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کرنے کا اصل کام وہی تھا جو اس نے انجام دے دیا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے یہاں اس قسم کی باتوں کا نہ صرف یہ کہ کوئی سوال نہیں تھا بلکہ آپ کو اس قسم کے ہر طرز عمل سے سخت کراہت تھی۔ آپ بڑے سے بڑا تالیفی کام کر گزرنے کے باوجود اسی فکر میں رہتے کہ نہ جانے اس کا حق ادا ہوا یا نہیں! محض لوگوں کی تعریف سے آپ کو خوشی حاصل نہ ہوتی۔ ہاں اگر کسی جگہ سے یہ اطلاع ملتی کہ فلاں کتاب سے فلاں شخص کو کوئی عملی فائدہ پہنچا ہے، اس کی زندگی میں تبدیلی آئی ہے یا اس کے نظریات بدلے ہیں، تو آپ بہت خوش ہوتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور اس خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دعا فرماتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہم خیال لوگوں سے کچھ داد وصول ہو گئی تو کیا فائدہ؟ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی تھی اسے فائدہ پہنچا یا نہیں؟

(میرے والد میرے شیخ صفحہ ۱۲۵)

یہ ہے نظریہ! اس شخصیت کا جس کی تفسیر معارف القرآن اردو کی سب سے مقبول ترین تفسیر ہے۔ اور جس کے علمی اور فقہی نوادرات سے آج دینی کتب خانے روشن اور منور ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہم خود اپنا جائزہ لیں! کہ جہاں اللہ نے دو ایک کتاب تالیف کرنے کی توفیق دی بس اپنے کو اکابر مصنفین کے زمرہ میں شمار کرنے لگتے ہیں اور متمنی رہتے ہیں کہ ہماری کتاب کی خوب خوب تعریف ہو، اور اس سے ہماری علمیت کا سکہ قائم ہو جائے وغیرہ وغیرہ اور اصل بات ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ کتاب سے دینی فائدہ کتنا پہنچا؟ اور کتنے لوگ اس سے فیضیاب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں واقعۃً بڑوں کے نقشِ قدم پر

چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

نقد خوش خبری

اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھیں گے اور جذبۂ تواضع کی پاسداری کریں گے تو اللہ تعالیٰ خود ہی ہمیں محبوبیت کا مقام عطا کردے گا جو واقعی پائے دار اور پر اثر ہوگا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ایک شخص محض اللہ کی رضا کے لئے کوئی کام کرتا ہے پھر اس سے لوگ محبت بھی کرنے لگتے ہیں اس کے متعلق کیا حکم ہے۔؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ (لوگوں میں محبوبیت) مومن کے لئے نقد خوشخبری ہے (کتاب الزہد ۲۵۰) یعنی اسے اپنے مخلصانہ عمل کا اجر جزیل تو آخرت میں ملے گا ہی تاہم لوگوں کی زبانوں پر اس کی خواہش کے بغیر اس کی تعریف آجانا یہ وہ نقد نعمت ہے جو اسے دنیا میں عطا کردی گئی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں اہل جنت اور اہل دوزخ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ جنتی وہ ہے جس کی اچھائیوں کی لوگ تعریف کرتے ہوں اور وہ انھیں سنتا ہو۔ اور جہنمی وہ ہے جس کی برائیاں اور بداخلاقیاں زبان زد ہوں اور وہ انھیں سنتا رہتا ہو۔ (کتاب الزہد ۱۵۴) اس لئے ہمیں چاہئے کہ لوگوں کی تعریفوں کو ہرگز مقصود نہ بنائیں لیکن ایسا کام بھی نہ کریں جس سے خواہ مخواہ لوگوں کی زبانیں ہمارے بارے میں کھلنے لگیں اور انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ اس لئے کہ لوگوں کے درمیان اعتماد اور بھروسہ باقی رہنا ایک عظیم نعمت ہے۔ جو ایک مرتبہ مجروح ہونے کے بعد دوبارہ اس درجہ کی ملنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر تہمت کی جگہ سے بہت دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور خاص کر جو شخص دین کی دعوت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہو اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کا علمبردار ہو۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم خدمت کی انجام دہی پر مامور ہو، اسے اپنا دامن ناجائز تو کجا خلاف اولیٰ اعمال و اقوال اور حرکات و سکنات سے

پوری طرح سے بچا کر رکھنا چاہئے تاکہ وہ دوہرے معیار پر عمل کرنے کا ملزم قرار نہ دیا جاسکے اس لئے کہ یہی دوہرا معیار اور قول وفعل کا تضاد آج ہمارے لئے ایک بدترین رستا ہوا ناسور بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے اس بیماری سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔ آمین

ملّی تنظیمیں مقبول کیوں نہیں؟

آج مسلمانوں کی ملی تنظیمیں ہر وقت اس فکر میں رہتی ہیں کہ انھیں عوامی مقبولیت کیسے حاصل ہو؟ چنانچہ اسی غرض سے بڑے بڑے اجلاس ہوتے ہیں اپنی "طویل و عریض" کارگزاریاں شائع کی جاتی ہیں اور قدیم و جدید "خدمات عالیہ" کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انہی رپورٹوں اور تشہیرات کو منتہائے مقصود، اور کامیابی کا مدار سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی پروگرام میں بڑا مجمع اکٹھا ہو جائے اور اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں اس کی اچھی رپورٹیں آجائیں تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے پروگرام کو ذرائع ابلاغ اور میڈیا اور قومی پریس نے نہایت اہتمام سے "کور" کیا ہے۔ گویا یہی ہمارے لئے سب سے بڑی معراج ہے بھلے سے اجتماع میں مسلمانوں کے حق میں کوئی ٹھوس نفع بخش پہلو سامنے نہ آیا ہو مگر "میڈیا کی نوازش" ہی ہمیں مطمئن کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ اخبار والوں کی خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ ان پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اور موقع ہو تو خلافِ شریعت اور ناجائز ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں مگر ان سب تشہیرات کے باوجود نتیجہ صفر رہتا ہے۔ یہ چیزیں عوام کے دلوں کو اپیل نہیں کرتیں۔ وقتی طور پر پروگراموں کا چرچا ضرور ہو جاتا ہے مگر جسے دلی مقبولیت کہا جاتا ہے وہ ان "مکڑی کے جالوں" سے کبھی بھی حاصل نہیں ہو پاتی۔ بلکہ مزید بدگمانیاں بڑھ جاتی ہیں۔ بار بار اپنی آنکھوں سے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور جتنی بار تجربہ ہوگا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد کی تصدیق ہوتی جائے گی" آپؐ نے ارشاد فرمایا، "کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کو ناراض کرکے

لوگوں کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے گا انجام کار اس کی تعریف کرنے والا بھی اس کی برائی پر اتر آئے گا۔ (الترغیب والترہیب، ۲/۲۰۰) اس لئے یہ ملی تنظیمیں اگر قیامت کی صبح تک بھی محض ذرائع ابلاغ کی تشہیر کو اپنی مقبولیت کا مدار سمجھتی رہیں گی تو بھی انھیں مقبولیت حاصل نہ ہو سکے گی۔ مسلم تنظیموں کو اگر واقعی مقبولیت چاہیئے تو شریعت کے دائرے میں رہ کر ملت کی اتنی خدمت کرنی ہوگی کہ بغیر کسی کے کہے خود بخود لوگوں کی زبانوں پر ان کے کارنامے آنے لگیں، جماعت کا اصل تعارف اس کے کام سے ہوتا ہے۔ کام کچھ بھی نہ ہو اور نام کے لئے ہزار کوششیں کرلی جائیں تو وہ سب فضول ثابت ہوتی ہیں۔ اور ہوتی رہی ہیں۔

ہماری تنظیموں کے مقبول اور مؤثر نہ ہونے کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اب ہم دینی فائدہ سے زیادہ محض اپنی جماعت کا مفاد پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور اللہ معاف کرے ہماری جدوجہد دین کی سربلندی اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے کم، دوسری جماعت کے مقابلہ کے لئے زیادہ ہوتی ہے۔ اور ہر وقت ہم اس ادھیڑبن میں رہتے ہیں کہ فلاں جماعت کہیں "فلاں کارنامہ" کا کریڈٹ نہ حاصل کرلے۔ اور اس صورتِ حال نے اب بڑھ کر "بین الجماعتی حسد" کی صورت اختیار کرلی ہے جس کی وجہ سے دینی محاذ پر آپسی تعاون کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک جماعت دوسری تنظیم کو کام کرتے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتی۔ اور کوئی نیا کام شروع بھی کیا جاتا ہے تو اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے مقابل جماعت کو زک پہنچائی جاسکے۔ خواہ اس سے دینی نفع ہو یا نہ ہو جماعت کی برتری ضرور ہونی چاہیئے۔ یہ تقابل اور مقابلہ برائے مقابلہ کے جذبات ہی ہماری جماعتوں کو گھن کی طرح اندر اندر کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اور جماعتوں کا وقار برابر مجروح ہو رہا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی ڈگر بدلنی چاہیئے۔ اور مقابلہ سے بے پروا ہو کر اور وسعتِ قلبی کے ساتھ تعاون و تناصر کے جذبہ کے ساتھ محض رضائے خداوندی کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ ساری محنتیں

اکارت ہوتی رہیں گی۔ اور یہ "پرشکوہ جماعتیں" کاغذی رپورٹوں اور اسٹیل کی الماریوں تک محدود ہو کر رہ جائیں گی اور بس۔۔۔۔۔

اپنا امتیاز نہ چاہیں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "دو بھوکے حملہ آور بھیڑئیے بکریوں کے ریوڑ میں گھس کر اتنا نقصان نہیں پہنچا پاتے جتنا مال اور جاہ کی محبت انسان کے دین کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ (الترغیب والترہیب ۴/۱۷۷)

ذرا غور فرمائیں! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو آپ کے جانثار صحابہؓ راستوں میں آپ کے لئے پلکیں بچھا دیتے اور اپنی ہر ادا سے اتنے احترام کا مظاہرہ کرتے کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہ جاتی۔ اور واقعی انھوں نے اپنی تک اس کا مظاہرہ کیا بھی لیکن اس بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا کہ آپؐ، صحابہؓ کے ساتھ امتیازی شان سے گریز فرماتے رہے اور اپنے قول وعمل سے امت کے بڑوں کو امتیازی شان اپنانے سے دُور رہنے کی تلقین فرماتے رہے۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر، اور خندق کی کھدائی میں آپؐ بنفس نفیس صحابہ کے شانہ بشانہ شریک رہے۔ سفر میں تشریف لے جاتے تو دیگر لوگوں کے ساتھ خود بھی ضروری خدمات انجام دیتے۔ عبداللہ ابن جبیر خزاعیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرات صحابہؓ نے دھوپ سے بچاؤ کی غرض سے آپؐ کے اوپر چادر سے سایہ کردیا۔ آپؐ نے سایہ محسوس فرما کر سر مبارک اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ چادر سے سایہ کیا گیا ہے تو آپؐ نے فرمایا اسے ہٹاؤ۔ اور خود اپنے دستِ مبارک سے چادر کھینچ کر نیچے فرمادی اور ارشاد فرمایا "میں بھی تو تم ہی جیسا ایک انسان ہوں"۔ (مجمع الزوائد ۹/۲۱) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نفسی کا معمولی سا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کھانا نوش فرما رہے تھے دوسرے لوگ بھی مجلس میں شریک تھے۔ ایک

شخص آیا جو چیچک میں مبتلا تھا اور اس کے زخم پھٹ رہے تھے۔ وہ مجلس میں جہاں بھی بیٹھنے کی کوشش کرتا تو قریب والا شخص اس کے پاس سے الگ ہٹ جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیمار شخص کو اپنے قریب بلایا اور اپنے پہلو میں بٹھا کر اسے کھانا کھلایا (احیاء العلوم ۴/۳۰۶) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی عظیم اخلاق نے آپ کو عالمی محبوب بنا دیا تھا۔ سفیان ثوریؒ اپنی جلالتِ شان کے باوجود مجلس میں امتیازی جگہ بیٹھنا پسند نہ فرماتے بلکہ کسی بھی کنارے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور ہمیشہ پیر سکیڑ کر تواضع سے بیٹھتے (مجلس میں پیر نہ پھیلاتے تھے کہ یہ تکبر کی نشانی ہے۔)

(العلم والعلماء حاشیہ ۳۵۸) اسی تواضع کا اثر ہے کہ آج جب سفیان ثوریؒ کا نام لیا جاتا ہے تو ایک عظیم محدّث اور صاحبِ ورع وتقویٰ بزرگ کا تصور ذہن میں ابھر آتا ہے اور دل ان کی عظمت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف آج ہم جب اپنی زندگی پر غور کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مقبولیت دلانے والے ان اخلاق کا پاسنگ بھی ہم میں نہیں پایا جاتا۔ ہماری عین خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ہر جگہ ہمارے ساتھ امتیازی معاملہ کریں حتیٰ کہ بہت سے لوگ تو اشتہار اور دعوت ناموں میں اپنے نام کی ترتیب بدلنے پر بھی چیں بجبیں ہو جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا نام بعد میں کیوں لکھا گیا۔ اور محض اسی بناء پر منتظمین سے پرخاش جمالیتے ہیں۔ اسی طرح جماعتی زندگی میں اگر کسی رکن سے مشورہ نہ لیا جائے تو آمادۂ بغاوت ہو جاتا ہے۔ اور اگر مجلس میں ہماری رائے کے خلاف کوئی مشورہ دیدے تو ہماری بھویں تن جاتی ہیں اور دوسری صحیح رائے آنے کے باوجود ہم اپنی بات پر صرف اس لئے اَڑے رہتے ہیں کہ کہیں ہماری بات نیچی نہ ہو جائے۔ اور بعض اوقات اس غلط روی کے نتیجہ میں جماعتوں اور اداروں کو سخت نقصان بھگتنا پڑ جاتا ہے۔ یہ ہٹ دھرمی تکبر کی بڑی نشانی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ حق کو انکار کر دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہی تکبر ہے

(الترغیب والترہیب ۳/۵۶۷) اسلئے ہمیں اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھنی چاہئے اور جب بھی حق بات سامنے آئے تو اسے قبول کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے خواہ وہ اپنی ذات سے متعلق ہو یا دوسروں سے اس کا تعلق ہو۔ ہمارے سلف صالحین ہر وقت اس تلاش میں رہتے تھے کہ اپنی کوئی غلطی ظاہر ہو اور فوراً اس کی اصلاح کی سعی کریں۔ سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میرے نزدیک سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے جو مجھ کو میرے عیوب سے آگاہ کردے۔ (العلم والعلماء ۱۶۷) عمر بن مہاجر جو خلیفۂ راشد حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ رحمۃ اللہ علیہ کے خاص لوگوں میں تھے فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے مجھ سے تاکیداً کہہ رکھا تھا کہ "جب تم مجھے راہِ حق سے ذرا بھی ہٹتا ہوا دیکھو تو میرا گریبان پکڑنا اور اسے زور سے ہلا کر پوچھنا کہ عمر تو کیا کر رہا ہے؟" (العلم والعلماء ۲۸۰)

یہ تھے وہ اخلاق فاضلہ جنھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اتنی مقبولیت عطا کی تھی کہ انسان تو انسان جنگل کے درندے بھی ان کے دورِ حکومت میں عدل وانصاف پر قائم اور ظلم وجور سے گریزاں تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

افسوس آج ہماری زندگیاں ان بزرگوں کے بلند کردار سے عاری ہو چکی ہیں۔ ظاہری زبانوں پر ان اسلاف کا نام ضرور ہے مگر باطن ان کی پاک سیرت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اب خود رائی، خودنمائی ہمارا وطیرہ اور دوسروں کی تحقیر ہمارا معمول بن چکی ہے اور ہم ان خطرناک امراض سے غافل اور بے خبر ہیں۔ اور چونکہ مرض کا احساس ہی نہیں اسلئے ان کے ازالہ کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ اور کبھی دل میں اصلاح کی بات آتی بھی ہے تو اپنے فعل کو صحیح قرار دینے کی اتنی تاویلیں نکل آتی ہیں کہ نعوذ باللہ گناہ کو ہی عین عبادت سمجھ لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اصلاح کی امید کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ واقعی ہماری اصلاح فرمائے۔ آمین۔

دوسرے کی عزتِ نفس کا خیال: مقبولیت کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ

انسان دوسرے کی عزت نفس کا خاص خیال رکھے اور اپنے کسی قول و عمل سے دوسرے کی تحقیر اور اذیت پہنچانے کا مرتکب نہ ہو۔ سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ تقریر کے دوران فرمایا کہ "کسی آدمی کے ظاہری کروفر کو دیکھ کر اس کے معتقد نہ ہو جاؤ بلکہ آدمی (لائق تعریف) وہ ہے جو امانت (اللہ اور بندوں کے حقوق) کو ادا کرتا ہو۔ اور لوگوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرتا ہو۔ (کتاب الزہد، ۲۴۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ لوگ ہیں، جو اچھے اخلاق رکھنے والے ہیں جو تواضع کی وجہ سے گویا لوگوں کے سامنے بچھے جاتے ہیں۔ جو خود بھی دوسروں سے محبت رکھتے ہیں اور دوسرے بھی ان سے مانوس رہتے ہیں"۔ اور فرمایا۔ کہ "میرے نزدیک تم میں سب سے ناپسندیدہ وہ لوگ ہیں جو چغلی کھاتے ہیں۔ دوستوں دوستوں میں نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ اور شریفوں میں عیب ڈھونڈا کرتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ۴/۴۱۰)

ایک روایت میں کسی مسلمان کی عزت پامال کرنے کو بدترین سود قرار دیا گیا ہے۔ (الترغیب والترہیب ۳/۵۰۳) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر مرحلہ پر اس بات کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ کسی عمل سے دوسرے کی دل شکنی نہ ہو جائے۔ اور کسی مسلمان کو ہمارے کسی برتاؤ سے خفت نہ اٹھانی پڑے۔ اسی وجہ سے آپ نے حکم دیا کہ لوگوں سے ان کے مرتبہ کے موافق معاملہ کرو۔ (مسلم شریف ۱/۴) آپ نے فرمایا کہ جب کسی قوم کا باعزت آدمی تمہارے پاس آئے تو اس کا اعزاز کرو۔ (ابن ماجہ شریف ۲/۲۷۰) نیز آپ نے ہدایت دی کہ جب کوئی شخص دوسری مسجد میں جائے تو وہاں کے مقررہ امام کی اجازت کے بغیر وہاں امامت نہ کرے۔ اور جب کسی کے گھر جائے تو مالکِ مکان کی مخصوص بیٹھنے کی جگہ (کرسی یا مسند خاص) پر اس کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھے۔ (مشکوٰۃ شریف ۱/۱۰۰) اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جو اذان دے اسی کو اقامت کہنے کا حق ہے۔ (ترمذی شریف ۱/۵۰) کیونکہ

ان باتوں کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے فطری طور پر دوسرے کو ناگواری ہوتی ہے۔ اور خواہ مخواہ دلوں میں نفرت کی آبیاری ہونے لگتی ہے۔

یحییٰ ابن یحییٰ اندلسیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم اپنے استاذ حضرت امام مالکؒ کی مجلس میں حاضر تھے کہ حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے حاضری کی اجازت چاہی۔ امام مالکؒ نے اجازت دے دی اور جب ابن المبارکؒ تشریف لائے تو آپ باوجودیکہ بڑے سے بڑے آدمی کے لئے اپنی جگہ سے نہیں اٹھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اعزاز میں کھڑے ہو گئے اور انہیں اپنی مسند پر اپنے پہلو میں لاکر بٹھایا۔ پھر ایک طالب علم نے حدیث کی عبارت پڑھنی شروع کی تو کبھی دورانِ درس امام مالکؒ کسی حدیث کے بارے میں عبداللہ ابن المبارکؒ سے پوچھتے کہ تمہارے پاس اس کے متعلق کیا علم ہے؟ تو حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ امام مالکؒ کے ادب اور آپ کی عزت کا خیال کرتے ہوئے ان کے استفسار کا جواب طلبہ کے سامنے بلند آواز سے نہ دیتے بلکہ آہستہ سے امام مالکؒ کو بتا دیتے تھے (تاکہ حاضرین پر امام مالکؒ کے سامنے ابن المبارکؒ کی بڑائی نہ ظاہر ہو) جب ابن المبارکؒ اجازت لے کر واپس تشریف لے گئے اور امام مالکؒ کو آپ کا کمالِ ادب بہت اچھا معلوم ہوا تو آپ نے ہم شاگردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا اِنہیں جانتے ہو؟ یہی خراسان کے فقیہ عبداللہ ابن المبارکؒ ہیں۔ (مقدمہ کتاب الزہد ۴۳) دیکھئے عبداللہ ابن المبارکؒ نے امام مالکؒ کی عزت کا کتنا خیال رکھا کہ کہیں ان کی احادیث اور علم کو دیکھ کر امام مالکؒ کے شاگردوں کی نظر میں استاذ کا رتبہ کچھ کم نہ ہو جائے

آج ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کیا ہم بھی اپنے بھائیوں اور ہمعصروں کی عزت کا اسی طرح کا خیال کرتے ہیں؟ ہمارا تو بس چلے تو ہم اپنے مقابلہ میں کسی کو عزت دار نہ رہنے دیں۔ ہم اپنے معمولی سے معمولی کام کی دوسروں سے تعریف چاہتے ہیں اور دوسرے کے بڑے سے بڑے کارنامہ کو خود اس انداز میں پیش کرتے ہیں گویا وہ کوئی کام

ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ اپنے سامنے کسی دوسرے کی تعریف بھی اچھی نہیں لگتی۔ اگر دوسرے کی تعریف ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم فوراً ممدوح کی زندگی کا وہ پہلو سامنے کر دیتے ہیں جس سے اس کا وقار اور مرتبہ سننے والوں کی نظر میں گھٹ جائے۔ الامان الحفیظ

اسی طرح اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ ایسا ہوتا ہے گویا وہ ہمارے بیگاری غلام ہوں۔ برسرِ مجلس ... ان کے ساتھ تمسخر اور تذلیل کا معاملہ کیا جاتا ہے جس سے دلوں میں کینہ اور بغض کی پرورش ہوتی ہے۔ اور بدگمانیوں کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو کبھی آتش جوالہ بن کر حکومتوں تک کو زیروزبر کر کے چھوڑتا ہے۔ وہ حکمراں جو اپنی رعایا اور ماتحتوں کی عزتِ نفس کا خیال نہ کرے اسے کبھی بھی اپنی رعایا سے عزت کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ اور ایسا حاکم کبھی بھی دلوں پر حکومت نہیں کر سکتا اور نہ مقبولیت کے درجہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ ہم جیسا معاملہ دوسروں کے ساتھ کریں گے۔ دوسرے بھی ویسا ہی معاملہ ہمارے ساتھ کریں گے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی اپنی جگہ عزت رکھتا ہے اور لوگوں کے سامنے رسوائی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ رسوائی غیرت مند آدمی کے لئے مال و دولت اور ملازمت چھن جانے سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ اس لئے شریعت میں دوسروں حتیٰ کہ غلاموں کی تذلیل سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ جس طرح ہم خود اپنی عزت دوسروں سے چاہتے ہیں اسی طرح دوسروں کو بھی اپنی طرف سے عزت دینے کی کوشش کریں۔ محبوبیت اور مقبولیت کا راستہ یہی ہے۔ جس کے بغیر مقبولیت کی تمنّا سراسر فریب ہے۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر، اور حلم و بردباری بھی مقبولیّت کی صفات میں نمایاں مقام کی حامل ہیں۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ عفو و درگذر سے انسان کی عزت اور سربلندی میں اضافہ ہی فرماتا ہے۔ (الترغیب والترہیب ۳/۳۰۷) ام المومنین حضرت عائشہ صدّیقہ

رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے تھے بلکہ عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ (شمائل ترمذی شریف ۲۳) سیدنا حضرت انس رضی ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف حاصل کیا لیکن اس پورے عرصہ میں کبھی آپ نے مجھے "اف" تک نہیں کہا۔ اور نہ میرے کسی کئے ہوئے کام پر یہ کہا کہ "یہ تم نے کیوں کیا؟" اور نہ کبھی میرے نہ کئے ہوئے کام پر یہ پوچھا کہ "یہ تم نے کیوں نہیں کیا؟" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے اچھے اخلاق والے تھے۔ (شمائل ترمذی ۲۳)

خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ امام علی ابن حسین ابن علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ جن کی مقبولیت و محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ولی عہد ہشام بن عبدالملک حج کے موقع پر مکہ مکرّمہ گیا اور بھیڑ کی وجہ سے کوشش کے باوجود اسے حجر اسود کے بوسہ کا موقع نہ مل سکا۔ ابھی وہ مطاف ہی میں تھا کہ "امام زین العابدین" تشریف لائے تو فوراً لوگوں نے ان کے لئے راستہ خالی کر دیا اور انھوں نے اطمینان کے ساتھ حجر اسود کی تقبیل کا شرف حاصل کیا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگوں نے ہشام سے پوچھا کہ "یہ کون ہیں؟" ہشام نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو فرزدق شاعر نے جواب دیا کہ میں انھیں جانتا ہوں۔ یہ امام علی ابن حسین زین العابدین ہیں۔ جن سے سرزمین عرب کا چپّہ چپّہ واقف ہے" اور آپ کی مدح میں ایک نہایت عمدہ قصیدہ پڑھا۔ انہی امام زین العابدینؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے تھے ان کی ضیافت کے لئے آپ نے غلام کو حکم دیا کہ گھر کے تنور میں جو گوشت بھن رہا ہے وہ جلدی پیش کرے! غلام گیا اور بھنے ہوئے گرم کباب سیخ سمیت لانے لگا اتفاق سے جلدبازی میں وہ گرم سیخ غلام کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے کی منزل میں امام زین العابدین کے کسی چھوٹے بچے کو جا کر لگی جس کے زخم کی تاب نہ لا کر وہ بچہ اسی وقت واصل بحق ہو گیا۔ امام زین العابدین کو جب معلوم ہوا تو آپ نے غلام کو ڈانٹا نہ پھٹکارا بلکہ اس پر مزید احسان

فرماتے ہوئے کہا " جا تو آزاد ہے " تو نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد بچہ کی تجہیز و تکفین میں لگ گئے۔ (العلم والعلماء ۲۷۵)

اس کے برخلاف آج ہمارا رویہ اپنے خادموں اور ماتحتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ خود ہی غور کرلیں۔ ذرا سا کوئی نقصان بے خیالی میں خادم کے ہاتھوں ہو جائے بس اس کی خیر نہیں۔ نہ جانے کتنے دنوں تک ایک ایک نقصان اور غلطی پر اسے طعنے سننے پڑتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ جس نقصان پر خادم کو بے تکان صلواتیں سنائی جاتی ہیں اگر وہ نقصان اپنے ہاتھوں ہو جاتا ہے (اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے) تو دل کو مطمئن کرنے کے لئے نہ جانے کتنی تاویلیں تراش لی جاتی ہیں اور اس پر کسی کا ٹوکنا بھی سخت برا لگتا ہے۔ اس دوہرے معیار سے رقابتیں بڑھتی ہیں اور جذبۂ احترام نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں منصب و وقار کا خیال رکھتے ہوئے وسعتِ ظرفی کا ثبوت دینا چاہئے۔ اور ہمارے معاملات غرور و رعونت اور غیر ضروری شدّت سے خالی رہنے چاہئیں۔ جبھی ہم لوگوں کے دل جیت سکتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ " اللہ تعالیٰ خود نرمی فرمانے والا ہے اور ہر چیز میں نرمی پسند فرماتا ہے (مسلم شریف ۳۲۲/۲) ایک دوسری روایت میں ہے کہ نرمی جس چیز میں بھی پائی جائے گی وہ اس کو مزین بنا دے گی اور اس کے برخلاف سختی جہاں بھی ہوگی وہ اس کو عیب دار بنا دے گی (مسلم شریف ۳۲۲/۲) اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ " اللہ تعالیٰ نرمی پر جو اجر عطا فرماتا ہے وہ سختی پر عطا نہیں کرتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے " نرمی " کی صفت سے نوازتا ہے۔ اور جس گھر والے نرمی سے محروم ہوں وہ واقعی (ایک بڑی نعمت سے) محروم کر دیئے گئے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ۴۱۶/۳)

ان تعلیمات سے معلوم ہوا کہ کسی بھی معاملہ میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لینا چاہئے اور کوئی خطا کار اگر غلطی پر ندامت کے ساتھ ہمارے پاس آئے تو ہمیں اسے معاف کر دینا چاہئے

اور آئندہ اس کی طرف سے اپنا دل بالکل صاف کر لینا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ " جو لوگوں پر رحم نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتا۔ (بخاری بحوالہ الترغیب والترہیب ۲۰۱/۳) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب کسی شخص کے پاس اس کا بھائی معذرت لے کر آئے تو خواہ وہ بھائی حق پر رہا ہو یا ناحق پر اسے اس کی معذرت قبول کر لینی چاہئے ورنہ وہ شخص حوض کوثر پر حاضری سے محروم رہے گا۔ (الترغیب والترہیب ۴۹۲/۳) آج ہمارا عام مزاج بن گیا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ ہماری نظروں سے گر جاتا ہے بس زندگی بھر کیلئے اس سے دشمنی دل میں بٹھالی جاتی ہے اور اس پر سے اعتماد اٹھا لیا جاتا ہے۔ ہمارا یہ طرز عمل بھی مقبولیت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے جسے دور کرنا ضروری ہے۔

حلم و بُردباری

اجتماعی زندگی میں انسان کو لوگوں کی اذیتوں پر صبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور اس موقع پر یہ صبر ہی انسان کی عظمت کو ثریا کی سی بلندی عطا کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ " آدمی اپنے حلم و بردباری کے ذریعہ دن کے روزہ دار، اور رات کے عبادت گذار کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ (الترغیب والترہیب ۴۱۸/۳) ۸ھ میں جب عبد القیس کا وفد یمن سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے سردار منذر ابن عائذ جو اشج عبد القیس کے لقب سے معروف ہیں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " آپ میں دو ایسی عادتیں پائی جاتی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ ایک حلم و بردباری، دوسرے دور اندیشی "، (فتح الملہم ۱۸۴/۱) ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص غصہ دلائے جانے پر بھی حلم کا معاملہ کرے اللہ کی محبت اس کے لئے ضروری ہو جاتی ہے۔ (الترغیب والترہیب ۴۱۹/۳) سیدنا حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپ نے ایک نجرانی چادر زیب تن فرما رکھی تھی جس کے کنارے سخت تھے۔ اچانک ایک دیہاتی آپ کے پاس آیا اور آپ کی چادر مبارک کو زور سے پکڑ کر کھینچا۔ میں نے اس وقت آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن کے ظاہری حصّے کو دیکھا جس پر سختی سے چادر کھینچنے کا نشان نمایاں تھا۔ پھر اس دیہاتی نے حضورؐ سے کہا کہ اے محمدؐ! مجھے اس مال میں سے دیئے جانے کا حکم کیجئے جو آپ کے پاس ہے۔ اس شخص کی اس سخت گستاخی کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجّہ ہو کر مسکرائے اور اسے عطیہ دینے کا حکم فرمادیا۔ (الترغیب ۳/۴۱۹)

غزوہ حنین کے موقع پر آپ مالِ غنیمت تقسیم فرمارہے تھے۔ اور مصالحِ شرعیہ کے پیشِ نظر تالیفِ قلب کے لئے نومسلموں کو زیادہ حصّہ دے رہے تھے تو ایک شخص نے آپ کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ تقسیم عادلانہ نہیں ہے"۔ جب اس کا یہ تبصرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا تو آپ صرف یہ ارشاد فرما کر خاموش ہو گئے کہ "اگر اللہ اور اس کا رسول ہی انصاف نہ کرے تو اور کون دنیا میں انصاف کرنے والا ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے کہ ان کو اس سے زیادہ (ان کی قوم کی طرف سے اس طرح کی) اذیتیں پہنچائی گئیں مگر انہوں نے برداشت سے کام لیا۔ (العلم والعلماء ۱۳۷)

غور فرمایئے! کیا آج ہم اپنے مخالف اور معترض کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں۔ ہماری تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمیں کسی طرح بھی اذیت پہنچانے والا کبھی چین سے نہ رہے اور ہر وقت انتقام لینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہ

امام ابوحنیفہؒ جو واقعی فقہ اسلامی کے شہنشاہ ہیں اور جن کا فیض آج دنیا کے چپّہ چپّہ میں جاری ہے ان کی مقبولیت اور بے مثال محبوبیت میں ان کی حلم و بردباری کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ "میں نے کبھی کسی کی برائی پر بدلہ نہیں لیا اور نہ میں نے کسی کو گالی دی۔ اور نہ کبھی کسی مسلمان یا ذمی پر ظلم کیا اور نہ کبھی کسی کے ساتھ خیانت کی اور نہ دھوکہ دیا"۔ (عقود الجمان ۲۸۸) ایک مرتبہ مناظرہ کے دوران فریقِ مخالف نے آپ کو زندیق اور بدعتی ہونے کا طعنہ دیا۔ ہم ہوتے تو شاید اس کی جان کو آجاتے اور غصّہ میں جل بھن جاتے۔ مگر حضرت امام صاحبؒ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "بھائی!

اللہ تمہیں معاف کرے۔ تم نے میرے بارے میں جو رائے قائم کی ہے۔ میرے بارے میں میرے اللہ کا علم اس کے برخلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "میں نے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اس کے علاوہ کبھی کسی کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور مجھے اس کی رحمت کے سوا کسی سے امّید نہیں۔ اور اس کی سزا کے علاوہ مجھے کسی کا خوف نہیں۔ سزا کا ذکر آتے ہی آپ پر سخت گریہ طاری ہوا تا آنکہ آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو اسی برا کہنے والے شخص نے معافی کی درخواست کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جاہلوں میں سے جو شخص میرے بارے میں غلط بات کہے وہ معاف ہے لیکن اہلِ علم میں سے جو شخص مجھ پر الزام لگائے تو وہ معاف نہیں اس لئے کہ علماء کی بیان کردہ غیبت ان کے مرنے کے بعد بھی (کتابوں وغیرہ میں) باقی رہتی ہے۔ (عقود الجمان ۲۲۶)

عبدالرزاق ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ حلیم اور بردبار کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ ہم مسجد خیف میں آپ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آپ کے گرد لوگوں کا مجمع تھا اس دوران بصرہ کے رہنے والے ایک شخص نے آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے جواب دے دیا تو اس سائل نے جرح کی کہ اس مسئلہ میں حسن بصری کی رائے تو یہ ہے۔ (اور آپ کی رائے ان کے خلاف ہے) تو آپ نے جواب دیا کہ "حسن بصریؒ سے غلطی ہو گئی۔ آپ کا یہ جواب سن کر ایک شخص جس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا اٹھا اور امام صاحب سے خطاب کر کے یہ گستاخانہ کلمات کہے کہ "اے زانیہ کے بچے تو یہ کیا کہتا ہے کہ حسن بصریؒ نے غلطی کی"۔ اس کی گستاخی دیکھ کر لوگوں میں شور مچ گیا۔ اور حاضرین نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر امام صاحبؒ نے سب کو خاموش کر دیا۔ پھر کچھ دیر سر جھکائے رہنے کے بعد نہایت سنجیدگی سے ارشاد فرمایا۔ ہاں بھائی! حسن بصریؒ سے غلطی ہوئی جب کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسئلہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمودہ روایت میں حق پر تھے۔ (عقود الجمان ۲۸۷) اللہ اکبر! کیا اس حلم و بردباری کی کوئی حد ہے! آج ہمیں کوئی یہ کہہ کے

دیکھے، پھر اس کے خلاف کیسی کیسی کارروائیاں تیار ہوتی ہیں۔ عاصم ابن یوسف رح کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسجد میں امام ابو حنیفہ رح درس و تدریس میں مشغول تھے اور مسجد کے ایک گوشہ میں ایک شخص آپ کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا مگر امام صاحب رح اپنے کام میں مشغول تھے نہ تو اس کی طرف متوجہ ہوتے نہ جواب دیا اور اپنے شاگردوں کو بھی اس سے گفتگو کرنے سے منع کر دیا۔ جب درس ختم ہوا (اور آپ دولت کدہ کی جانب تشریف لے چلے) تو وہ شخص بھی آپ کے پیچھے ہو لیا (اور برا بھلا کہتا رہا) امام صاحب جب اپنے گھر پہنچے تو دروازے پر کھڑے ہو کر اس گالی دینے والے شخص سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ "بھائی یہ میرا گھر ہے! اگر تم اپنی بات پوری کرنا چاہو حتی کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ سب کہہ لو تو شوق سے کہو (میں اسے سن ہی کر اندر جاؤں گا) امام صاحب رح کا یہ حلیمانہ جواب سن کر وہ شخص شرمندہ ہو گیا (عقود الجمان ۲۹۱)

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رح کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ وعظ فرما رہے تھے ایک شخص درمیان سے اٹھا اور کہنے لگا کہ "مولوی صاحب! ہم نے سنا ہے کہ تم حرامی ہو" تو شاہ صاحب رح نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ میاں تم نے غلط سنا ہے میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ "بڈھانہ پھلت اور خود دلّی میں موجود ہیں۔ (ارواح ثلثہ ۶۹)

اسی طرح کا واقعہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کا بھی ہے ایک مرتبہ آپ درس دے رہے تھے کسی گستاخ نے یہ رقعہ بھیجا کہ "آپ اپنے باپ سے نہیں ہیں" جب آپ نے یہ پرچہ پڑھ کر سنایا تو ساری مجلس میں کھلبلی مچ گئی اور حاضرین طلبہ غیظ و غضب میں بھر گئے۔ آپ نے نہایت حلم و بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خبردار! کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا حق ہے کہ میں اسے تسلی کر دوں پھر فرمایا کہ میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ محلہ الہ داد پورہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ موجود ہیں خط بھیج کر یا جا کر سمجھ لیا جائے۔ (بیس بڑے مسلمان ۵۱۵)

تحریکات کے دور میں حضرت شیخ الاسلام کو جس قدر جی بھر کر مطعون کیا گیا اور آپ کے سامنے

بدترین انداز میں گستاخیاں کی گئیں ان کا تصور بھی اس دور میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حضرت شیخ رح ہمیشہ بے مثال حلم اور بردباری کا مظاہرہ فرماتے رہے۔ ایک مرتبہ آپ کے کچھ جانثاروں نے آپ کے مخالفین کی ہجو میں کچھ اشعار شائع کرانے چاہے تو آپ نے انھیں رکوا دیا۔ اور پوچھنے پر فرمایا کہ "میرے بھائی! میرے ساتھ جس کسی نے جو کچھ کہا ہے یا کوئی آئندہ کرے گا میں سب کو معاف کر چکا ہوں۔ آپ میری وجہ سے کسی کو برا بھلا نہ کہیں نہ کسی کے لئے بد دعا کریں۔ (بیس بڑے مسلمان ۵۱۴)

ان اکابر کے کردار کی روشنی میں آج ہمیں اپنے طرز عمل کا جائزہ لینا چاہئے۔ کہ ان حضرات نے ذاتیات کے اختلاف پر کس طرح صبر و تحمل سے کام لیا اور آج ہم کس طرح اپنے مخالفوں سے انتقام لینے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ یاد رکھیں جب تک انسان میں حلم و بردباری اور صبر و تحمل کی صلاحیت نہ ہو وہ کسی بھی اجتماعی ذمہ داری کو نہ تو نبھا سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ماتحتوں کی نظر میں مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ ہم حلم کے عادی بنیں اور انتقامی جذبات سے پوری طرح محفوظ رہیں۔ اللہ رب العزت ہماری مدد فرمائے۔ آمین

زہد و استغنا

مقبولیت کی ایک اہم صفت زہد و استغنا ہے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے جو مجھے اللہ تعالیٰ اور لوگوں کی نظر میں مقبول و محبوب بنا دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی اور زہد اختیار کرلو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔ اور لوگوں کے مال و دولت سے نظریں پھیر لو تو لوگوں کی نگاہ میں محبوب بن جاؤ گے (الترغیب والترہیب ۴/۱۵۴)

واقعہ یہ ہے کہ زہد سے متصف ہوئے بغیر لوگوں کے قلوب متوجہ ہو ہی نہیں پاتے

جہاں ذرا سا لالچ کا شبہ ہوا دینی منصب کی عزت داغدار ہوجاتی ہے اور جب استغناء ہوتا ہے تو یہی دنیا جس کے دیدار کے لئے در در کی ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں زاہد کے قدموں میں آکر گرتی ہیں اور وہ اسے بے نیازی کے ساتھ جھاڑ کر آگے چل دیتا ہے ۔

ہمارے اکابر دیوبند کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ چھتہ مسجد دیوبند میں اپنے کمرہ کے سامنے چھپر میں حجامت بنوا رہے تھے کہ شیخ عبدالکریم صاحب رئیس لال کرتی میرٹھ آپ سے ملنے کے لئے خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے ان کو دور سے آتا دیکھا۔ جب وہ قریب آئے تو ایک تغافل کے ساتھ رخ دوسری طرف پھیر لیا گویا کہ دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ آکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے ہاتھ میں رومال میں - - - بندھے ہوئے بہت سے روپئے تھے۔ جب انھیں کھڑے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تو حضرت مولانا نے ان رئیس صاحب کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ آہا شیخ صاحب ہیں مزاج اچھا ہے۔ انہوں نے سلام عرض کیا اور قدم چوم لئے اور وہ روپیہ بندھا ہوا قدموں پر ڈال دیا۔ حضرت نے اسے قدموں سے الگ کر دیا تو انہوں نے ہاتھ باندھ کر بمنت قبول فرمانے کی درخواست کی بالآخر بہت انکار کے بعد انہوں نے تمام روپیہ حضرت کی جوتیوں میں ڈال دیا۔ حضرت جب اٹھے تو نہایت استغناء کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا۔ حضرت نے جوتے پہن لئے اور حافظ انوارالحق سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ ہم بھی دنیا کماتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیادار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انھیں ٹھکراتی ہے۔ اور یہ فرما کر وہ روپیہ وہیں تقسیم فرما دیا۔
(ارواح ثلثہ ۲۸۲)

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ دنیاداروں سے ہمیشہ خودداری اور استغناء کیساتھ پیش آتے رہے۔ ایک مرتبہ ریاست رامپور تشریف لے گئے۔ نواب رامپور نے اپنے وزراء

کے ذریعہ آپ کو اپنے دربار میں بلانے کی درخواست کی۔ حضرت نے اولاً تو اعذار کئے جب زیادہ اصرار ہوا تو صاف کہہ دیا کہ "نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں۔ اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے مل لیں ان کے پیروں میں مہندی تو نہیں لگی ہے اور بغیر ملے وہاں سے چل دیئے۔" (ارواح ثلثہ ۲۸۲)

امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے زہد و استغناء کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ افغانستان کے بادشاہ امیر حبیب اللہ نے اپنے سفیر کے ذریعہ آپ کی خدمت میں پانچ ہزار روپئے بھیجے اور یہ لکھا کہ ہر سال اتنی ہی رقم پیش کی جاتی رہے گی لیکن حضرت نے کمال استغناء کا نمونہ پیش فرماتے ہوئے یہ نذرانہ قبول نہیں کیا اور جواب لکھ دیا کہ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور حق تعالیٰ نے مجھے بہت دے رکھا ہے جمع کر کے کیا کروں گا اسلئے واپس کرتا ہوں کسی دوسرے مصرف خیر میں خرچ کر دیا جائے"۔ (بیس بڑے مسلمان ۲۱۳)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ جنھوں نے واقعۃً اپنے دور میں تجدیدی کارنامے انجام دیئے ہیں اور جن کا علمی، روحانی فیض آج پورے عالم میں جاری ہے۔ ایک مرتبہ آپ کو ڈھاکہ کے مشہور و معروف نواب سلیم اللہ خاں صاحب نے باصرار ڈھاکہ آنے کی دعوت دی حضرت نے انکے اصرار پر دعوت کی قبولیت کے لئے چند شرطیں لکھ کر بھیجدیں جن میں سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ کسی قسم کا نقد یا غیر نقد ہدیہ نہ دیا جائے"۔ اس سفر میں نواب صاحب نے تمام شرائط کا خیال رکھا۔ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد دوبارہ پھر انہی نواب صاحب نے آپ کو دیگر علماء دیوبند کے ساتھ ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ ان حضرات کو کلکتہ ہو کر ڈھاکہ جانا تھا۔ کلکتہ میں ان کے قیام و طعام کے انتظام کے لئے نواب صاحب نے اپنے ایک دوست کو متعین کر دیا۔ جب حضرت تھانوی قدس سرہ کلکتہ پہنچے تو نواب صاحب کے دوست نے شایان شان انتظام کیا اور بہت مسرت کا اظہار کیا

اور دورانِ گفتگوان رئیس صاحب نے یہ اصرار کیا کہ حضرت ہدیہ نہ قبول کرنے کی شرط واپس لے لیں۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "یہ کیا ضروری ہے کہ محبوبؔ کو گھر بلاکر ہی ہدیہ دیا جاتے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جاکر یا گھر بھیج کر بھی ہدیہ دیا جاسکتا ہے"۔ وہ رئیس صاحب اپنی مالداری کے زعم میں کہنے لگے کہ "جناب معاف فرمائیے پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا"۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس رئیس کی اس بات پر نہایت کبیدہ خاطر ہوتے۔ اور عالمانہ استغناء کا اظہار فرماتے ہوئے فرمایا کہ "آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے۔ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے۔ اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں۔ دین اور دنیا۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے بھی یعنی دنیا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے۔ لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے آپ ہمارے محتاج ہوتے یا ہم آپ کے۔ آپ پیاسے ہوتے اور ہم کنواں ہوتے۔ یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہوتے۔ اور یہ فرماکر کلکتہ ہی سے خود اپنے کرایہ سے واپس تھانہ بھون تشریف لے آتے اور ڈھاکہ نہیں گئے۔ (بیس بڑے مسلمان ص۲۴۴، ۲۴۵) اور نواب صاحب اصرار کرتے رہ گئے۔

آپ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نواب رامپور کی دعوت پر قادیانیوں سے مناظرہ کے لئے رامپور تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت نواب صاحب نے حضرت کو کرایہ سے کچھ زیادہ رقم دینی چاہی تو آپ نے یہ کہہ کر رقم واپس کردی کہ "ریاست کو بیت المال سے زائد از ضرورت صرف کرنے کا شرعًا اختیار حاصل نہیں ہے"۔ (بیس بڑے مسلمان ص۲۴۶) الغرض آپ نے ہمیشہ امراء اور نوابوں کے مقابلہ میں شانِ استغناء کا مظاہرہ کیا۔

اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے کبر و نخوت کے کس بل نکال ڈالے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے سامنے بڑے سے بڑے لکھپتی لوگ بھی اپنی ذلت محسوس کیا کرتے تھے اور علماء کی وقعت و اہمیت کھل کر ان کے سامنے آجاتی تھی اور اس حدیث کا صحیح منظر نظر آتا تھا کہ جو شخص اپنی فکرِ آخرت کی کامیابی کو بنالے تو دنیا اس کے قدموں میں ذلیل ہوکر آتی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ جب بھی کہیں وعظ و تقریر یا قومی و ملی اجتماعات میں شرکت کے لئے اسفار میں تشریف لے جاتے تو کرایہ سے زائد رقم ہرگز وصول نہ فرماتے۔ اور اگر کبھی دی بھی جاتی تو دیوبند واپس تشریف لاکر حساب کرکے مابقیہ رقم منی آرڈر کے ذریعہ واپس فرمادیتے۔ بہت سے واقعات حضرت کے اس طرح کے موجود ہیں۔ حضرت کے خلیفۂ اجل حاجی . . . محمد ایوب صاحب بھاگلپوری رحمۃ اللہ علیہ نے خود راقم الحروف کو لکھا کہ میں نے بارہا حضرت مدنی قدس سرہٗ کو دیکھا کہ وہ جہاں بھی جلسوں میں تشریف لے جاتے تو کرایہ سے زائد رقم واپس کردیتے۔ نیز حضرت قدس سرہ کا معمول یہ بھی رہا کہ کبھی کسی بڑے سے بڑے مالدار سے مرعوب نہیں ہوئے۔ جب بھی کوئی غلط بات دیکھتے تو کسی کی رورعایت کئے بغیر کھل کر نکیر فرماتے۔ خاص طور پر داڑھی منڈانے پر نہایت شدت سے نکیر فرماتے اور اس میں کسی کے مال و دولت یا منصب کا قطعًا خیال نہ فرماتے۔ آپ کے اس طرز عمل کا اثر یہ تھا کہ بڑے بڑے سرمایہ دار آپؒ کی مجلس میں دست بستہ کھڑے نظر آتے اور یہ تمنا کرتے کہ کاش حضرت ان پر کرم فرماتے ہوئے ان کے کسی ہدیہ کو شرفِ قبولیت بخش دیں۔ اور حضرت کی مجلس میں آکر ان مالداروں کو اپنی دولت و ثروت حقیر معلوم ہونے لگتی۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے دور کے زبردست مفسر

مجاہد اور مصلح تھے اور جن کا فیض آج بھی پاکستان میں جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے، آپ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ جب بھی کہیں تبلیغی دورہ پر تشریف لے جاتے تو اپنا کرایہ خرچ کر کے جاتے ۔ دوسروں سے کرایہ نہیں لیتے تھے ۔ اور پہلے ہی دعوت دینے والے سے یہ کہدیا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ نے توفیق دی کرایہ ہوا تو آؤں گا ورنہ نہیں آؤں گا۔

ایک مرتبہ نواب محمد حیات خاں صاحب قریشی جو اپنے علاقہ کے بڑے رئیس تھے ۔انھوں نے اپنے علاقہ میں آنے کی دعوت دی اور دینی ضرورت کا اظہار کیا۔حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں جانے کو تیار ہوں لیکن شرط ہے کہ مجھکو آمد و رفت کے کرایہ اور کھانا کھانے پر مجبور نہ کیا جائے ۔چنانچہ آپ نواب صاحب کے علاقہ میں اس شان سے تشریف لے گئے کہ چمڑے کے مصلے میں بھنے ہوئے چنے باندھ لئے اور ایک لوٹا ساتھ رکھ لیا اور جتنے دن بھی وہاں قیام فرمایا، دن بھر وعظ و تقریر کرتے اور رات میں چنے چبا کر پانی پی لیتے ۔ ایک دن بھی نواب صاحب کے یہاں کھانا نہیں کھایا ۔ آپ فرماتے تھے کہ دنیا دار کے غرور کو کاٹنے کے لئے میں نے استغناء سے تیز دھار دار آلہ نہیں دیکھا ۔نیز آپ فرماتے تھے کہ اگر میں دنیا داروں سے تحفہ و تحائف لیتا اور مرغ پلاؤ کھاتا ؟ تو شیطان ان کو سکھاتا کہ حضرت صاحب خاطر مدارات کروا گئے اور کرایہ کے نام سے پیسے بھی لے گئے اور یہیں وعظ بھی سنا گئے "عوض معاوضہ گلہ نہ دارد"۔ اس طرح سے میرے سارے اوقات ائیگاں جاتے اور نہ ان کی آخرت سنورتی اور نہ میں ہی عند اللہ ماجور ہوتا۔ (بیس بڑے مسلمان ص۶۸۲)

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے کہ اللہ والوں کی صحبت میں استغناء عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کی صفات پیدا ہوتی ہیں ۔

خطیب الہند حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ جن کی خطابت آج بھی برصغیر میں ضرب المثل اور زبان زد خاص و عام ہے ۔آپ کی شان استغنا یہ تھی کہ جلسوں کے موقع پر منتظمین جو بھی مصارف سفر پیش کرتے آپ کبھی ان کو گنتے نہ تھے اور کمی بیشی کا آپ کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا ۔آپ فرمایا کرتے تھے کہ دولت انسان کی خدمت کے لئے ہے مخدوم بننے کے لئے نہیں ۔ مال جمع کرنے اور گننے میں لذت محسوس کرنا اہل جہنم کا نشان ہے ۔ (بیس بڑے مسلمان ص۵۶۶)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پوری زندگی زہد و استغناء کے ساتھ گذاری ہے ۔سہارنپور کے زمانۂ قیام میں کئی مرتبہ آپ کو حیدرآباد اور ڈھاکہ وغیرہ سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلایا گیا۔ لیکن آپ نے صاف لکھدیا "مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احساں بن کر"۔

روپے پیسے کی حیثیت آپ کی نظر میں ٹھیکروں کے برابر بھی نہیں تھی۔ دکھاوے اور بناوٹ کا زندگی میں نام و نشان تک نہ تھا۔ اس سادگی اور استغناء کے باوجود مقبولیت اور محبوبیت کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے اہل ثروت آپ کی قدم بوسی کے لئے خادموں کی طرح آگے پیچھے رہتے تھے ۔

یہی حال آپ کے خلیفۂ اجل اور جانشین فقیہ الامت حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کا رہا ۔حضرت مفتی صاحبؒ کو کانپور کے زمانۂ قیام کے دوران صرف ستر روپے تنخواہ ملتی تھی جن میں سے ساٹھ روپے گھر بھیجتے تھے اور صرف دس روپے میں اپنا مہینہ بھر کا خرچ چلاتے تھے ۔ یہ حال اس وقت تھا جب کہ آپ کا کانپور کے ہر طبقہ میں اعزاز و احترام کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے سرمایہ دار آپ سے متأثر تھے لیکن آپ نے ان سب تعلقات کے باوجود اپنی صفت استغناء پر کبھی حرف نہ آنے دیا۔ آخری وقت تک آپ کے زہد و استغناء کا یہی حال رہا ۔آپ کے ترکہ میں شائد

کتابوں کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر سامان یا جائداد وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ افریقہ تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے مختلف ہدیے تحفے لانے شروع کئے ۔ اور دارالعلوم کے چندے کی بھی پیشکش کی ۔ لیکن آپ نے یہ عام اعلان فرمادیا کہ میں یہاں دین کی کچھ باتیں سنانے کیلئے آیا ہوں، سب حضرات اسکے سننے کی طرف متوجہ ہوں' کوئی صاحب مجھے ذاتی طور پر کوئی ہدیہ پیش کریں اور نہ دارالعلوم کے لئے یہاں چندہ دیں، جو صاحب دارالعلوم کی اعانت کرنا چاہتے ہیں، وہ براہ راست اپنی رقم دارالعلوم کراچی کے پتے پر ارسال فرمادیں ۔ چنانچہ تقریباً دو ماہ کے اس سفر میں آپ نے ان باتوں پر سختی کے ساتھ عمل فرمایا' اور چند انتہائی بے تکلف حضرات کے سوا جن سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے، نہ کسی سے کوئی ہدیہ قبول کیا ۔ اور نہ دارالعلوم کے لئے چندہ وصول فرمایا۔

اس اخلاص اور للہیت کا ثمرہ یہ تھا کہ دو ماہ کے اس دورے نے نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ۔ بے نمازی لوگ نمازی بن گئے ۔ بعض عادی قسم کے لوگوں نے ام الخبائث سے توبہ کرلی، نوجوانوں نے دین سیکھنا شروع کر دیا ۔ اور وہاں کے حضرات اب تک اس دورے کی حسین یادیں بھول نہیں پائے ۔ (میرے والد میرے شیخ ۱۶۶)

الغرض دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ اس طرز عمل نے ہمارے بڑوں کو وہ اوج ثریا عطا کیا ہے جس کی سربلندی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور ان کی خدمات میں وہ برکتیں ظاہر ہوئی ہیں جن کا پھل ہم برابر سمیٹ رہے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارا طرز عمل اپنے اسلاف کے طرز عمل سے ہٹتا جا رہا ہے ۔ آج محض ذاتی فائدہ کے لئے دنیا داروں کی خوشامد کا رجحان روز افزوں ہے اب صرف مال و دولت ہی کو ہم عزت و سربلندی کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں اور اس مقصد کے لئے ہم نے اپنے علمی اور دینی منصب تک کو داؤ پر لگا دیا ہے ۔ اہل دنیا سے خوش خلقی اور ان کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ ممنوع نہیں لیکن خطرہ کی چیز ان کے ساتھ اس

طرح اپنے ذاتی اغراض وابستہ کرنا ہے جس سے وہ ہمیں اپنا محتاج سمجھنے لگیں، جو شخص مالداروں سے اس انداز کا تعلق رکھے گا وہ کبھی بھی آزادانہ طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا ۔ اور نہ عنداللہ مقبولیت حاصل کر سکتا ہے ۔ اس لئے کہ قدم قدم پر اس کی ذاتی مصالح آڑے آتی رہیں گی ۔ اور وہ مجبور ہو کر اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتا رہے گا ۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں جہاں بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کا ذکر ہے وہاں ان کا یہ اعلان بھی نقل کیا جاتا ہے کہ قل لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی رب العلمین یعنی میں تم سے اپنی محنت پر کسی صلہ کا مطالبہ نہیں کرتا، میری خدمات پر تو رب العلمین اجر عطا کرے گا ۔ آج بھی ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں ۔ لوگوں پر اسی شخص کی بات زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جو بے غرض اور بے نیاز ہو کر وعظ و تذکیر کا فرض انجام دے ۔

امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ انسان کو اپنے اندر سورج کی تین صفات پیدا کرنی چاہئے ۔ (۱) ایک یہ کہ وہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے ۔ اس میں کبھی اضمحلال نہیں آتا ہے ۔ اسی طرح ... ہمیں بھی اپنی دینی محنت برابر جاری رکھنی چاہئے ۔ (۲) دوسرے یہ کہ سورج پورے عالم کو بلا کسی امتیاز کے روشنی پہونچاتا ہے ۔ اسی طرح ہمارے ایمان کی روشنی بھی عالمگیر ہونا چاہئے ۔ (۳) تیسرے یہ کہ وہ اپنی روشنی اور حرارت پر کبھی کسی اجرت اور معاوضہ کا طلبگار نہیں رہتا ہے ۔ اسی طرح ہمیں بھی دین کے پہونچانے پر دنیا والوں سے کسی نفع کی امید نہ رکھنی چاہئے ۔

حاصل یہ کہ علماء کی سربلندی کا راز اسی زہد و استغناء میں مضمر ہے ۔ ایک حدیث میں ہے کہ عز المومن استغناءہ عن الناس یعنی لوگوں سے بے پرواہ ہونے

میں ایماندار کی عزت ہے۔ (مذاق العارفین ۳/۲۳۶) ۔ یہ صفت ہماری پیشانی کا ٹیکہ ہے دینی و دنیوی وجاہت و شرافت کی پختہ ضمانت ہے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ علماء اگر زہد اختیار کریں تو بڑے بڑے جابر لوگوں کی گردنیں ان کے آگے جھک جائیں لیکن یہ لوگ اپنے علم کو دنیا داروں پر اس نیت سے خرچ کرتے ہیں تاکہ ان کو کچھ مل جائے۔ اسی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے گر گئے۔ (تاریخ مشائخ چشت ص۱۴۲) ۔

اس کے برخلاف دنیا کا یہ مال و دولت ہمارے لئے عزت کی چیز نہیں بلکہ یہ سخت آزمائش ہے۔ جس میں خال خال ہی افراد کھرے اترتے ہیں۔ روایت ہے کہ جب کسریٰ کے خزانے سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ لائے گئے تو حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ مال بیت المال میں تقسیم کے لئے رکھ دیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں اسے کسی چھت کے نیچے نہیں رکھوں گا تا آنکہ اسے۔۔ تقسیم نہ کر دوں۔ چنانچہ وہ خزانے مسجد نبوی کے صحن میں رکھ دیئے گئے اور رات بھر لوگ اس کی حفاظت کرتے رہے۔ صبح کو جب حضرت عمرؓ نے وہ خزانے کھولے تو ان میں سونے اور چاندی کے سکوں پر نظر پڑی تو آپ رونے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا اے امیر المومنین آپ کیوں روتے ہیں، آج تو شکر خداوندی اور فرحت و شادمانی کا دن ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ یہ مال و دولت جب بھی کسی قوم کو دیئے گئے ہیں تو ان میں آپس میں بغض و عداوت ڈال دی گئی ہے۔ (اس خطرہ سے مجھے رونا آرہا ہے) کتاب الزہد ص۲۶۵) ۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ خزانے جنھیں دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنی آنکھوں پر قابو نہ رکھ سکے تھے

آج ہمارے لئے سب سے پسندیدہ بن گئے ہیں جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہمارے قلوب بدل گئے۔ دوسروں کو برداشت کرنے کی قوت جاتی رہی۔ اور ادارے تنظیمیں اور جماعتیں مقابلہ آرائی کے میدان میں تبدیل ہوگئیں۔ حتیٰ کہ ایک ہی مکتب فکر کے افراد کا اتحاد و اتفاق خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

سخاوت اور مہمان نوازی

دنیا سے بے رغبتی اور استغناء کا اثر سخاوت کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے جو شخص جتنا زیادہ دنیا سے بے رغبت ہوگا۔ اتنا ہی خوش دلی سے جود و سخا کرنے والا ہوگا۔ یہ صفت شرافت کی سب سے مقبول ترین صفت ہے۔ احادیث طیبہ میں بھی اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سخی شخص اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے۔ لوگوں سے قریب ہے اور جہنم سے دور ہے۔ اور اس کے برخلاف بخیل شخص اللہ سے دور ہے جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جہنم سے قریب ہے۔

(الترغیب والترہیب ۳/۳۸۱)

اور بے علم سخی اللہ کے نزدیک بخیل عبادت گذار سے زیادہ پسندیدہ ہے (الترغیب ۳/۳۸۱) سخاوت اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین صفت ہے۔ (الترغیب ۳/۳۸۳) ۔ اللہ کے ہر ولی کی طبیعت سخاوت اور خوش خلقی پر ہی ڈھالی جاتی ہے۔ (الترغیب ۳/۳۸۳) ۔ نیز فرمایا کہ سخی گھرانے کی طرف رزق خداوندی اتنی تیزی سے متوجہ ہوتا ہے جتنے میں چھری اونٹ کے کوہان کاٹنے میں کارگر نہیں ہوتی۔ (الترغیب ۳/۳۸۴) ۔ اس کے مقابلہ میں بخل اور کنجوسی انسان کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی صفات پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں جو کبھی سچے ایماندار میں جمع نہیں ہوتیں ۔ ۱؎ بخل ۲؎ بد خلقی ۔ (الترغیب ۳/۳۸۰)۔ ایک حدیث میں ہے کہ کنجوسی سے زیادہ اسلام کو مٹانے والی صفت اور کوئی نہیں ہے ۔ (الترغیب والترہیب ۳/۳۸۰)۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اعلیٰ درجہ کی صفت سخاوت سے متصف تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی کسی نے سوال کیا تو آپؐ نے سائل کو منع نہیں فرمایا ۔ (شمائل ترمذی ۲۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی سخاوت کا سب سے زیادہ مظاہرہ رمضان المبارک میں ہوتا تھا ۔ جب آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور فرماتے تھے تو آپ کی سخاوت کا ایسا زور ہوتا تھا گویا کہ باران رحمت کی ہوائیں چل رہی ہیں ۔ (شمائل ترمذی شریف ۲۴) ۔ ایک صحابیہ حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تازہ کھجوروں کا ایک گچھہ اور چند چھوٹے چھوٹے کھیرے لے کر گئی تو آپ نے اس کے بدلہ میں مجھے مٹھی بھر کر زیور اور سونا عطا فرمایا ۔ (شمائل ترمذی شریف ۲۴) ۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کچھ سوال کیا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے تم میری طرف سے کسی سے قرض لے لو جب میرے پاس ہوگا تو ادا کر دوں گا ۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول ! آپ نے اسے خواہ مخواہ دیدیا ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی وسعت سے زیادہ کا مکلف تو نہیں بنایا ہے ۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کا یہ کہنا ناگوار گذرا ۔ یہ دیکھ کر ایک انصاری صحابی نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول آپ بے فکر ہو کر خرچ کیا کریں اور عرش کی مالک ذات یعنی اللہ تعالیٰ کیطرف

سے کمی کا خوف نہ کریں ۔ انصاری صحابی کی یہ بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر تبسم پھیل گیا اور روئے انور سے بشاشت نمایاں ہوگئی اور فرمانے لگے کہ مجھے اسی بات کا حکم ہوا ہے ۔ (شمائل ترمذی ۲۴) ۔ دراصل یہ سخاوت توکل کی علامت ہے جس شخص کے دل میں جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ پر توکل ہوگا اتنا ہی وہ سخاوت کی صفت سے متصف ہوگا ،

حضرات صحابہؓ کی زندگیوں میں سخاوت کا عنصر بہت نمایاں تھا ۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ، حاجتمندوں کی حاجت روائی کرنا ، اسی طرح مہمانوں کی ضیافت کا جذبہ ان کی طبیعت میں رچا اور بسا ہوا تھا ۔ ان صفات میں ہر فرد ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا ۔ جس کے پاس جو کچھ ہوتا وہ سائل کو محروم نہ کرتا غربت کا زمانہ ہو یا مالداری کا ، تنگی ہو یا وسعت ، ہر حال میں جود و سخا کے تسلسل میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی تھی ۔ حضرات صحابہ کے حالات اس قسم کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں ۔ جن کو بیان کرنے کے لئے مستقل کتاب چاہیے ۔

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تو آپ کو غسل دینے والوں نے آپ کی پیٹھ پر کالے کالے نشانات دیکھے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان آٹے کی بوریوں کے نشانات ہیں جنہیں آپ رات میں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے جاتے اور مدینہ منورہ کے فقراء اور محتاجوں کو تقسیم کر کے آتے تھے ۔ (العلم والعلماء ۲۷۲)۔ آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ خود اپنے آپ کو بخیل سمجھتے تھے لیکن جب آپ کا وصال ہوا تو معلوم ہوا کہ مدینہ کے سو غریب گھرانوں کا خرچہ آپ ہی چلاتے تھے ۔ محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ مدینہ کے کچھ لوگ ایسے تھے کہ انھیں پتہ چلتا تھا کہ ان کی روزی کہاں سے آتی ہے ۔ (رات میں چپکے سے کوئی دے جاتا تھا)۔ جب حضرت زین العابدینؒ کا وصال ہوا تو یہ سلسلہ بند ہوگیا ۔ (العلم والعلماء ۲۷۵) ۔ امام زین العابدینؒ

فرمایا کرتے تھے کہ جس آدمی میں یہ وصف ہو کہ مانگنے والوں کو اپنا مال دیا کرتا ہو وہ سخی نہیں ہے بلکہ سخی وہ ہے کہ جو حقوق اللہ تعالیٰ نے اپنے اہل طاعت کے لئے لکھ دیئے ہیں ان کو بدون طلب پہلے ہی پہونچا دیا کرے اور نفس میں اس پر شکریہ لینے کی خواہش نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل ثواب ملنے کا یقین ہو۔ (مذاق العارفین ۲/۲۶۷)

امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، دیکھا کہ شرکاء مجلس میں ایک شخص کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں تو آپ نے اسے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ تاآنکہ دیگر اہل مجلس چلے گئے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ اپنے مصلے کے نیچے جو کچھ ہو اسے لیلو اور اپنی ضروریات میں صرف کرلو۔ اس نے جب مصلی اٹھایا تو اس میں ایک ہزار درہم نکلے جسے وہ لے کر چلا گیا۔ (العلم والعلماء ۳۰۶)۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ابن عیینہؒ قرض کی وجہ سے قید ہو گئے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے ان کا سارا قرضہ جو چار ہزار درہم سے زیادہ تھا اپنی طرف سے ادا کر کے انھیں قید سے رہائی دلائی۔ (العلم والعلماء ۳۰۶)۔ اسمٰعیل بن حمادؒ کہتے ہیں کہ جب امام ابوحنیفہؒ کے صاحبزادے حضرت حمادؒ استاذ کے پاس سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لائق ہو گئے تو امام صاحب نے ان کے استاذ کو پانچ سو درہم (اور ایک روایت میں ہے کہ ایک ہزار درہم) بطور ہدیہ ارسال فرمائے تو وہ استاذ صاحب حیرت میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ میں نے کون ایسا کام کیا ہے کہ مجھے اتنا زیادہ انعام دیا گیا، امام صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ خود ان استاذ صاحب کی خدمت میں تشریف لے گئے اور معذرت کے انداز میں ارشاد فرمایا کہ جناب آپ نے میرے بچے کو جو سکھایا ہے اسے حقیر نہ سمجھیں۔ اللہ کی قسم اس وقت ہمارے پاس اور زیادہ ہوتا تو ہم قرآن کی تعظیم میں اسے بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ (عقود الجمان ۲۳۳)۔ واقعی یہ ہے سخاوت اور قرآن کی عظمت جس نے امام صاحبؒ کو مقبولیت کی بلندیوں تک پہونچا دیا تھا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ایک بڑی خصوصیت جس کی مثال شاذونادر ہی ملتی ہے، یہ تھی کہ آپ اپنے ہمعصر علماء و مشائخ پر بے دریغ خرچ فرمایا کرتے تھے اور خود ان کی ضروریات کا خیال فرماتے تھے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ مشائخ کے نام پر سامان تجارت بغداد بھیجتے اور وہاں سے ضرورت کا سامان منگواتے اور اس تجارت میں جو نفع ہوتا وہ اکابر علماء و مشائخ اور محدثین کے لئے سال بھر جمع کرتے رہتے۔ پھر اس رقم سے ان مشائخ کی ضروریات زندگی کپڑے، غلہ جات وغیرہ خرید کر ان حضرات کے گھر پہونچاتے اور پھر بھی اگر رقم بچ جاتی تو وہ نقد کی صورت میں ان کو پیش فرماتے اور یہ کہتے کہ ان سے آپ اپنی روزمرہ کی ضرورتیں پوری فرمائیں اور اللہ کے علاوہ کسی کا شکریہ ادا نہ کریں۔ اس لئے کہ میں اپنے مال میں سے آپ کو کچھ نہیں دیا۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے، یہ آپ ہی کے سامان کا نفع ہے۔ اللہ کی قسم یہ تو اللہ تعالیٰ نے بس میرے ذریعہ آپ تک پہونچایا ہے اور کچھ نہیں۔ (عقود الجمان ۲۳۳)۔ مسعر بن کدامؒ سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ دستور تھا کہ جب بھی اپنے اہل و عیال کے لئے کچھ خریدتے تو اتنا ہی دیگر علماء عظام کے لئے بھی خرید فرماتے۔ جب کپڑا بناتے تو پہلے علماء و مشائخ کے لئے انتظام فرماتے حتیٰ کہ اگر پھل فروٹ خریدنے ہوتے تو پہلے مشائخ کے یہاں خرید کر بھجواتے پھر اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے خریدتے تھے۔ (عقود الجمان ۲۳۴)

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ بہت زیادہ خیرات کرنے والے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے پاس اس قدر کثیر مقدار میں ہدیہ بھیجا کہ مجھے اس کی زیادتی سے ناگواری ہوئی جس کا ذکر میں نے امام صاحبؒ کے بعض شاگردوں سے کیا تو ان شاگردوں نے کہا یہ تو کچھ نہیں ہے۔ اگر آپ وہ ہدیہ دیکھ لیتے جو امام صاحب نے سعید بن عروبہ کو بھیجا ہے (تو اس کی کثرت کے مقابلہ میں) اپنے ہدیہ پر کچھ تعجب نہ کرتے (عقود الجمان ۲۳۴) امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اپنے

سب پہچان کے لوگوں پر نہایت خرچ کرنے والے تھے، کبھی آپ کسی کو پچاس دینار دیتے پھر اگر وہ لوگوں کے سامنے شکریہ ادا کرتا، تو آپ کو سخت افسوس ہوتا۔ اور آپ فرماتے کہ بھائی اللہ کا شکر ادا کرو، یہ رزق آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ (عقود الجمان ۲۳۵)۔ امام ابو یوسفؒ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میرے استاد امام ابو حنیفہؒ نے میرے اور میرے گھر والوں کا کل، خرچ دس سال تک اپنے پاس سے ادا فرمایا ہے اور میں نے آپ سے زیادہ نیک صفات کا جامع کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ (عقود الجمان ۲۳۵) حسن بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ سخی کسی کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ہر ایک جماعت کا ماہانہ وظیفہ اپنی طرف سے مقرر کر رکھا ہے اور سالانہ تحفہ و تحائف کا معمول اس سے علاوہ تھا۔ (عقود الجمان ۲۳۵)۔ عبداللہ بن بکر سہمیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مکہ جاتے ہوئے راستہ میں میرا اونٹ والے سے کرایہ پر جھگڑا ہو گیا۔ امام صاحب بھی راستے میں ہمراہ تھے۔ وہ اونٹ والا فیصلہ کے لئے مجھے امام صاحب کے پاس لے گیا۔ امام صاحبؒ نے ہم دونوں کے بیانات سنے۔ پھر پوچھا کہ اصل اختلاف کتنی مقدار میں ہے۔ اونٹ والے نے کہا کہ چالیس درہم میں تو امام صاحب نے تعجب سے فرمایا کہ لوگوں کی مروت بالکل ہی جاتی رہی (کہ چالیس درہم پر جھگڑا ہونے لگا۔) عبداللہ کہتے ہیں کہ امام صاحب کی اس وسعت ظرفی پر میں تو شرمندہ ہو گیا اور امام صاحب نے اپنی طرف سے اونٹ والے کو چالیس درہم ادا فرمائے۔ (عقود الجمان ۲۳۷)۔ امام صاحب کے اس طرز عمل کو سامنے رکھ کر آج ہمیں اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہم ایک ایک روپیہ پر رکشہ والوں سے لڑتے نظر آتے ہیں، ویسے چاہے کتنے روپے خرچ کر لیں گے لیکن رکشہ والے کو ایک روپیہ زائد دیتے ہوئے طبیعت کو سخت ناگواری ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جن کے مقام مقبولیت کا ذکر بار بار گذشتہ اوراق میں آچکا ہے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ وقت کے علماء اور مشائخ پر خرچ فرمایا کرتے تھے آپ کی سالانہ خیرات کا تخمینہ ایک لاکھ درہم لگایا گیا ہے (کتاب الزہد مقدمہ ۵۰) ایک مرتبہ ایک شخص جو سات سو درہم کا مقروض تھا، حضرت عبداللہ بن مبارک کے پاس آیا اور اپنے قرض کی ادائیگی میں مدد کی درخواست کی۔ حضرت نے اسے ایک تحریر لکھ دی اور کہا کہ فلاں جگہ میرے منشی سے جاکر یہ لکھی ہوئی رقم وصول کر لو۔ وہ شخص پرچہ لے کر آپ کے منشی کے پاس پہونچا۔ پرچہ میں سات ہزار درہم لکھے ہوئے تھے، منشی نے اس شخص سے پوچھا کہ تم نے کتنے درہم کی بات کی تھی؟ اس نے کہا کہ میں نے سات سو درہم مانگے تھے تو منشی یہ سمجھا کہ حضرت سے سہواً سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں اس لئے اس شخص کو انتظار کرنے کو کہا کہ میں تمھیں تحقیق کر کے بتاتا ہوں اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کے پاس رقعہ لکھ کر بھیجا کہ شاید آنجناب سے سہواً سات ہزار لکھ گئے ہیں اب آپ جیسا فرمائیں ویسا معاملہ کیا جائے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے منشی کو لکھا کہ "جب یہ تحریر تمھارے پاس پہونچے اور تم اسے سمجھ کر پڑھ لو تو اس شخص کو ۱۴ ہزار درہم ادا کر دو"۔ تو اس منشی نے جواب لکھا کہ اگر یہی طرز عمل رہا تو بہت جلد سارا سرمایہ جاتا رہے گا۔ منشی کے اس جواب پر حضرت عبداللہ بن مبارک ناراض ہو گئے اور لکھا کہ اگر تم میرے منشی ہو تو میرا حکم نافذ کر دو، اور اگر تم مجھے اپنا منشی سمجھتے ہو تو آؤ تم میری جگہ بیٹھو میں تمھاری مسند پر رونق افروز ہوں گا اور تمھارے حکم کی تابعداری کروں گا۔ (کتاب الزہد مقدمہ ۴۸)۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جب سفر میں تشریف لے جاتے تو اپنے ساتھیوں کو کچھ خرچ نہ کرنے دیتے بلکہ ان کی سب ضروریات خود پوری فرماتے اور قسم قسم کے کھانوں کا ان کے لئے انتظام فرماتے۔

بہت سی مرتبہ حج کے اسفار میں بھی آپ نے ساتھیوں کا مکمل خرچہ برداشت کیا حتیٰ کہ ان کے تحفے تحائف بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں خود خرید کر فروخت فرمائے۔ (کتاب الزہد مقدمہ ۴۶)۔

ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہم میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جہاں دیگر اوصاف حمیدہ میں اپنی مثال آپ تھے، وہیں سخاوت میں بھی آپ امتیازی مقام پر فائز تھے۔ مہمانوں کی کثرت اور مہمان نوازی کے اہتمام میں اپنی معمولی سی تنخواہ میں جب گذارا نہ ہوا تو اہلیہ کا زیور بیچ ڈالا۔ اہلیہ بھی تابعدار تھیں بخوشی اجازت دیدی اور پوری زندگی مہمان نوازی میں اپنے شوہر نامدار کا تعاون کرتی رہیں حضرت خود فرماتے تھے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ (آپ کی اہلیہ محترمہ) کی بدولت ہے (بیس بڑے مسلمان ۱۱۸)۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مہمان نوازی بھی ضرب المثل ہے ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولانا (شیخ الہندؒ) میں تواضع اور مہمان نوازی کی خاص شان تھی اور اس میں مسلم اور غیر مسلم اور امیر یا غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا بلکہ جو بھی مہمان آپ کے یہاں آتا، آپ ان کی نہایت خوش دلی سے خبرگیری فرماتے اور اسے آرام پہونچانے میں دلی مسرت محسوس فرماتے تھے۔

پھر یہ صفت آپ کے محب ومحبوب شاگرد رشید اور سچے جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ میں اس طرح منتقل ہوئی کہ جود وسخا اور آپ کا اسم گرامی گویا کہ دونوں لازم وملزوم بن گئے۔ جہاں بھی حضرت مدنیؒ کا نام لیا جاتا ہے تو آپ کی سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی ۔ ۔ ۔ کا تصور قائم ہوجاتا ہے عام طور پر آپ کے دسترخوان پر ۴۰، ۵۰ مہمان شریک طعام ہوتے اور آپ دل وجان سے نہایت بشاشت کے ساتھ ان مہمانوں کی خبرگیری فرماتے۔ بعض

لوگ اپنے کام سے دیوبند آتے اور حضرتؒ کے یہاں کھانے کے وقت پہونچ جاتے لیکن حضرت پر قطعاً ناگواری نہ ہوتی۔ اگر کوئی آپ سے ملنے والا شخص دیوبند آتا اور کسی دوسرے کے پاس ٹھہر جاتا یا کھانا کھا لیتا تو معلوم ہونے پر آپ بازپرس فرماتے بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی مہمان کے زیادہ ٹھہر جانے پر مہمان خانہ کے بعض خدام نے اسے عار دلادی تو حضرت مدنی کو انتہائی غصہ آیا اور اس کے طرز عمل پر سخت تنبیہ فرمائی۔ آپ خود ہمیشہ مہمانوں کے ساتھ کھانا اور ناشتہ تناول فرماتے۔ اخیر عمر میں جب ڈاکٹروں نے آپ کو پرہیز کے لئے بڑا گوشت کھانے سے منع کردیا اور چھوٹے جانور کا گوشت کھانے کی تاکید کی تو آپ نے اس وقت تک ڈاکٹر کے مشورے کو قبول نہ کیا جب تک کہ سب مہمانوں کے لئے چھوٹے گوشت کا انتظام نہ ہوگیا۔

الغرض مہمان نوازی کا ایسا جذبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا کہ اپنا سب کچھ مہمان پر لٹا دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ سردی کے زمانہ میں اپنا لحاف مہمان کو دیدیا اور خود اپنی عبا اوڑھ کر رات گذاری۔ اکثر فرمایا کرتے کہ میری خواہش ہے کہ میرے گھر میں مہمانوں کی ضروریات کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہو۔ علاوہ ازیں سفر میں تشریف لے جاتے تو کوشش فرماتے کہ ساتھیوں کا ٹکٹ سے لیکر قیام و طعام تک کا صرفہ خود برداشت کریں۔ مدینہ منورہ سے کھجوریں آتیں تو پورے ہندوستان میں اپنے خاص متعلقین کو اہتمام کے ساتھ ہر سال متعینہ حصہ ارسال فرمایا کرتے اور پھر باوجودیکہ مدرسہ کی تنخواہ کے علاوہ آپ کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی آپ کتنے غریب مسکینوں اور بیوگان کو اپنی جانب سے ذاتی طور پر ماہانہ وظیفہ ارسال فرماتے اور جو شخص بھی آپ سے سوال کرتا اسے کبھی رد نہ فرماتے اور دوست کے مطابق اس کی امداد فرماتے۔ بسا اوقات دوسروں کی طرف سے قرض ادا کرنے کے مواقع بھی آئے اور آپ نے اپنے متعلقین کے قرض ادا فرما کر اکابر واسلاف کی سنت زندہ

زندہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آپ کی بے مثال فیاضی کی بنیاد یہ تھی کہ آپ کی نظر میں یہ دنیا کی زیب و زینت ٹھیکروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ آپ پوری زندگی اس سے اعراض ہی فرماتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ الحمد للہ آج بھی آپکے جانشین سیدی و مرشدی حضرت اقدس مولانا سید اسعد صاحب مدنی دامت برکاتہم کے وسیع دستر خوان پر حضرت مدنیؒ کی فیاضی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

عارف باللہ حضرت اقدس مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا دستر خوان بھی بہت وسیع تھا۔ عام طور ۵۰، ۶۰ بلکہ بسا اوقات سو سو مہمان موجود رہتے۔ اور حضرت خوش دلی سے ان کے قیام و طعام کا انتظام فرماتے اور خصوصی مہمان ہوتے تو ان کے لئے حسب موقع تکلفات بھی ہوتے۔ روپیہ پیسہ کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ تھا کہ اکثر جو بھی نذرانہ آتا، چاہے کم ہو یا زیادہ خادموں میں سے جو بھی حاضر ہوتا اسے عنایت فرمادیتے۔ آپ کے خادم حاجی فضل الرحمٰن خاں کا بیان ہے کہ "کئی لاکھ روپے حضرت نے صرف میرے ہاتھوں سے دوسروں کو دلوائے ہیں" جو اہل علم حضرات آپ کی خدمت میں آتے۔ چلتے وقت کرائے کے نام پر گرانقدر رقم انھیں عطا فرماتے (تین بڑے مسلمان ۶۲۸)۔

شیخ الحدیث حضرت قطب عالم مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی مشہور و معروف ہے۔ اخیر زمانہ میں رمضان المبارک کے علاوہ عام دنوں میں بھی سیکڑوں مہمان آپ کے دستر خوان پر موجود ہوتے اور ضیافت کے ساتھ ساتھ ضرورتمندوں اور متعلقین کو نقد ہدایا سے وقتاً فوقتاً سرفراز فرماتے رہتے جس کی تفصیلات خود آپ کے خلفاء نے بیان فرمائی ہیں۔

(دیکھئے حضرت شیخ الحدیثؒ اور ان کے خلفاء کرام)

یہی منظر راقم الحروف نے حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ

کے یہاں دیکھا، کتنے غریب طلباء آپ کے وظائف پر تعلیم حاصل کرتے اور کوئی بھی ضرورت مند آجاتا تو اسے محروم نہ فرماتے۔ اور آپ کے خدام تو برابر آپ کے عطایا سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔

ان حضرات اکابر رحمہم اللہ کی زندگیاں ہمارے لئے قابل تقلید اور لائق اتباع ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ان اخلاق کو اپناکر دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کے مستحق بنیں۔ اور جس صفت میں اپنے اندر کوتاہی پائیں اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

ایک آسان طریقہ

اللہ کی راہ میں خرچ کی عادت ڈالنے کے لئے ایک نسبتہً آسان اور سہل طریقہ نظر سے گذرا جو مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا معمول تھا۔ آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی فرماتے ہیں:

آپ کا یہ معمول تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک معین حصہ فوراً مصارف خیر میں خرچ کرنے کے لیے علیحدہ فرما لیتے تھے۔ اور طے یہ کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو اسکا بیسواں حصہ (پانچ فیصد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے (مثلاً انعام ہدیہ تحفہ وغیرہ) تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے۔ آپ کے پاس ہر قسم کی رقم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں ایک صندوقچی میں مختلف تھیلے یا لفافے رکھے رہتے تھے۔ جس پر اس مد کا نام درج ہوتا تھا۔ مثلاً "خانگی اخراجات" "آمد و رفت کے اخراجات" وغیرہ۔ اسی صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا جس پر "صدقات و مبرات" لکھا رہتا تھا۔ تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراخی کا، آمدنی کا مذکورہ حصہ آپ فوراً اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے۔ اور جب تک

یہ حصہ "صدقات ومبرات" کے تھیلی میں نہ چلا جاتا اس وقت تک اس آمدنی کا استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اگر دس روپے بھی کہیں سے آئے ہیں تو فوراً اس کے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس طریقہ کار کی برکت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی خیرات کا مصرف سامنے آتا ہے تو اس وقت سوچنا نہیں پڑتا کہ اس میں رقم کہاں سے دی جائے۔ بلکہ یہ یہ صدقات ومبرات کا تھیلہ ہر وقت یاددہانی کراتا رہتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف تلاش کیا جائے۔ (میرے والد میرے شیخ ١٥٥)۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ اولاً انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ اور داعیہ ہی پیدا نہیں ہوتا اور کبھی ہوتا بھی ہے تو ہاتھ خالی ہونے کی وجہ سے تمنا دل ہی دل میں رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم بھی اپنی آمدنی کا کچھ فیصدی حصہ لازمی طور پر علیحدہ نکال کر اللہ کی راہ میں خرچ کا اپنے آپ کو عادی بنالیں تو بڑی برکت کی چیز ہوگی۔ اگر ارادہ کرلیا جائے تو یہ بڑا مشکل کام نہیں اور اس کے فوائد اتنے ہیں جو الفاظ میں بیان نہیں کئے جاسکتے۔ اسی طرح صدقۂ جاریہ میں بھی ہمیں حتی الوسع بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا معمول تھا کہ جب بھی کہیں مسجد کی تعمیر کی خبر سنتے تو اس میں کچھ نہ کچھ حصہ لینے کی کوشش کرتے۔ اپنے مدرسہ میں دو کمرے اپنے خرچ سے تعمیر کرائے اور انھیں مسجد پر وقف کردیا۔ بہت سی کتابیں مدرسہ کے کتبخانے پر وقف فرمائیں اور اپنا ذاتی کتبخانہ بھی وقف فرمادیا جو اس وقت کم از کم ایک لاکھ روپے کی مالیت کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ (میرے والد میرے شیخ ١٥٧)

ورع وتقویٰ

مقبولیت عنداللہ کے لئے حرام اور مشتبہ معاملات سے حتی الامکان احتراز کرنا بھی لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے قرآن کریم میں جگہ جگہ ایمان والوں کو تقویٰ کا حکم فرمایا ہے اور اس کی عزت وشرافت کا معیار بتایا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تم میں اللہ سے ڈرنے والا ہو)۔ احادیث طیبہ میں بھی جابجا تقویٰ کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے ایک صحابی کو وصیت فرمائی کہ اتق اللہ فانہ ازین لامرک کلہ، اللہ سے ڈرتے رہو، اس لئے کہ یہ صفت تمہارے تمام دینی اور دنیوی معاملات اور افعال کو مزین اور خوبصورت بنانے والی ہے۔ تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے خوف سے تمام معاصی اور حرام کاموں سے اپنے کو بچالے۔ اور یہ بات جبھی حاصل ہوسکتی ہے جب کہ حرام کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی باتوں سے بھی بچے جو دیکھنے میں درجۂ جواز میں آسکتی ہیں۔ اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

ان الحلال بین وان الحرام بین	بیشک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے
وبینهما امور مشتبہات لایعلمهن	اور ان دونوں کے درمیان میں مشتبہ چیزیں ہیں
کثیر من الناس، فمن اتقی الشبہات	جن کا حکم اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص
فقد استبرأ لدینه وعرضه ومن	شبہ کی چیزوں سے بچ رہا وہ اپنے دین اور عزت
وقع فی الشبہات وقع فی الحرام	کو بچالے گیا اور جو شبہ کی چیزوں میں مبتلا ہوگیا وہ
(بخاری ومسلم)	(انجام کار) حرام میں مبتلا ہوگیا۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شبہ کی چیزوں سے بچنے کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے اس کا اندازہ آپ کے اس ارشاد سے ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں کبھی گھر والوں کے پاس جاتا ہوں تو اپنے بستر پر کوئی کھجور پڑی پاتا ہوں تو اور اسے کھانے کے لئے اٹھا بھی لیتا ہوں لیکن پھر مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ صدقہ

کی نہ ہو اس لئے اسے وہیں ڈال دیتا ہوں۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "انسان اس وقت تک متقین کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا جب تک کہ حرج والی چیزوں سے بچنے کے لئے بہت سی ایسی چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن کے انجام دینے میں (بظاہر) کوئی حرج نہیں ہے۔ (ترمذی، جامع العلوم والحکم ۷۳)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا کمال یہ ہے کہ رائی کے دانے کے برابر بھی گناہ سے بچے اور اپنے اور حرام کے درمیان پردہ قائم کرنے کے لئے بہت سی حلال چیزیں بھی چھوڑے رکھے"۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "متقی لوگوں میں تقویٰ اسی وقت باقی رہے گا جب تک کہ وہ حرام سے بچنے کے لئے مباحات کو ترک کرتے رہیں گے"۔ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ ہے کہ متقین کا نام متقین اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے امور سے بچتے ہیں جن سے عام طور پر بچا نہیں جاتا۔

(جامع العلوم والحکم ۷۳)

الغرض اللہ کے دربار میں قبولیت حاصل کرنے کے لئے ورع و تقویٰ ایک ناگزیر امر ہے۔ اور دنیا میں جو مبارک ہستیاں بھی مقبولیت کے منصب پر فائز ہوئی ہیں ان کی زندگیوں میں ورع و تقویٰ کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے غلام نے آپ کے سامنے کھانا پیش کیا۔ آپ بھوکے تھے اس لئے آپ نے تحقیق کئے بغیر کھانا نوش فرمالیا۔ بعد میں غلام سے پوچھا کہ یہ کھانا تم کہاں سے لائے تو اس نے جواب دیا کہ زمانہ جاہلیت میں میں نے ایک قبیلہ میں جھاڑ پھونک کی تھی، انھوں نے مجھے اس کی اجرت دینے کا وعدہ کر رکھا تھا، آج میرا ان کے پاس سے گذر ہوا تو وہاں کوئی خوشی کی تقریب ہو رہی تھی تو انھوں نے مجھے یہ کھانا دیدیا۔ یہ سن کر سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے تو تو مجھے ہلاک

کر دیتا اور ہاتھ ڈال کر سارا کھانا قے فرمادیا۔ اور جو کچھ اندر رہ گیا تو پانی پی کر پھر نکالتے جاتے تا آنکہ پورا معدہ اس شبہ کے کھانے سے صاف کر لیا۔ (العلم والعلماء ۱۴۷)

احنف بن قیس فرماتے ہیں کہ ہم امیرالمومنین سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک باندی گزری تو لوگ بول پڑے کہ یہ امیرالمومنین کی باندی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنکر فرمایا کہ "امیرالمومنین کی کوئی باندی نہیں ہے۔ اور یہ اس کے لئے حلال بھی نہیں، یہ تو اللہ کے مال میں سے ہے۔ (یعنی بیت المال کی ملکیت ہے) تو ہم نے حضرت سے پوچھا کہ امیرالمومنین کے لئے اللہ کے مال میں سے کتنا لینا حلال ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! عمر کے لئے سال بھر میں دو جوڑے۔ ایک سردی کا اور ایک گرمی کا۔ اور اتنی مقدار جس سے حج اور عمرہ کر سکے۔ اور اس کے اور اس کے گھر والوں کو کافی ہونے والی روزی جیسا کہ قریش کے ایک متوسط شخص کو دی جاتی ہے (بس اتنا لینا حلال ہے)۔ (جامع العلوم والحکم ۱۲۶)

دیکھئے۔ یہ ہے امیرالمومنین کا حال۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو تم میں سب سے زیادہ اچھا کھانے والا اچھا لباس پہننے والا بن جاؤں لیکن میں اپنی تمام اچھائیوں اور آرام و راحت کو آخرت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ (ایضاً ۱۶۷)۔

خلیفہ راشد سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ورع و تقویٰ کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ جب آپ خلیفہ بنے تو آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ جو خلیفہ عبدالملک کی بیٹی تھیں ان کے بیش قیمت زیورات کے متعلق آپ نے صاف فرمادیا کہ اے فاطمہ! دو میں ایک بات اختیار کر لو یا اپنے زیور مجھے دیدو میں انھیں بیت المال میں جمع کردونگا۔ یا پھر میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بات مجھے ناپسند ہے کہ میں اور زیورات ایک گھر میں رہیں۔ آپ کی اہلیہ نے بھی کمال جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ یہی نہیں اس سے کئی گنا زیادہ بھی زیورات ہوں تو بھی میں انھیں آپ پر ترجیح

نہیں دے سکتی چنانچہ وہ زیورات حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لے کر بیت المال میں جمع کرا دیئے۔ (جامع العلوم والحکم ۲۸۵)۔

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ورع و تقویٰ ضرب المثل ہے۔ آپ کے تمام معاصر کھلے الفاظ میں گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے دور میں امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ متقی نہیں دیکھا۔ علی بن حفص کہتے ہیں کہ حفص ابن عبدالرحمٰن امام ابوحنیفہؒ کے کاروبار میں شریک تھے۔ ایک مرتبہ امام صاحبؒ نے ان کے پاس کچھ سامان فروخت کے لئے بھیجا اور کہا کہ اس میں ایک کپڑا ہے جس میں فلاں عیب ہے، اسلئے جب اسے فروخت کریں تو گاہک سے عیب بیان کر دیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ حفص بن عبدالرحمٰن نے وہ سب سامان بیچ ڈالا اور عیب بتانا بھول گئے اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ کس نے وہ کپڑا خریدا ہے جب امام ابوحنیفہؒ کو یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے عیب بتائے بغیر سامان بیچ دیا ہے تو آپ نے اسکی ساری آمدنی صدقہ فرما دی جس کی مقدار بیس ہزار درہم تھی۔ اور حفص ابن عمر سے کاروباری شرکت ختم کر دی۔ (عقود الجمان ۲۴۱)۔ ایک مرتبہ کوفہ میں کچھ لوگ بکریاں کہیں سے لوٹ مار کر کے لائے اور انھیں کوفہ کے بازار میں فروخت کر دیا۔ وہ بکریاں شہر کی بکریوں میں رَل مل گئیں۔ اور لوٹ کی بکریوں کی شناخت باقی نہ رہی۔ جب امام ابوحنیفہؒ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ بکری زیادہ سے زیادہ کتنے سال زندہ رہ سکتی ہے تو لوگوں نے جواب دیا کہ سات سال۔ تو آپ نے کوفہ میں رہتے ہوئے سات سال تک بکری کا گوشت تناول نہیں فرمایا۔ کہ کہیں یہ وہی چرائی ہوئی بکری کا گوشت نہ ہو۔ (عقود الجمان ۲۴۴)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ ایک گھر کی دیوار کے قریب دھوپ میں بیٹھے تھے۔ یحیی ابن ابی زائدہ وہاں سے گذرے۔ امام صاحب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انھوں نے کہا کہ حضرت دھوپ میں بیٹھنے کے بجائے قریب میں دیوار کے سائے میں تشریف فرما ہوتے

تو بہتر ہوتا۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ میرا اس گھر کے مالک پر قرض ہے اگر میں اس کی دیوار کے سایہ سے فائدہ اٹھاؤں گا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ قرض پر نفع اٹھانے کی وعید میں داخل ہو جائے گا اور میں اسے گو کہ عام لوگوں پر واجب نہیں سمجھتا لیکن بات یہ ہے کہ عالم کو اپنے علم پر دوسروں سے زیادہ عمل پیرا ہونا چاہئے۔ (عقود الجمان ۲۴۴)

امام احمد بن حنبلؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ تین دن سے بھوکے تھے۔ کسی سے آپ نے آٹا بطور قرض لیا۔ گھر والے آپ کی حالت سے واقف تھے انھوں نے جلدی کی وجہ سے آپ کے صاحبزادے صالح (جو سرکاری ملازم تھے) کے تنور میں آپ کی روٹی پکا دی۔ آپ نے پوچھا کہ یہ روٹی کہاں پکائی گئی ہے تو گھر والوں نے بتا دیا کہ آپ کے صاحبزادے کا تنور پہلے سے جل رہا تھا اس میں ہم نے پکالی تو آپ نے سرکاری آمدنی (جو عموماً ظالم حکمرانوں کے جبریہ ٹیکس وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے) سے بچتے ہوئے اس تنور میں پکی ہوئی روٹی کھانے سے انکار فرما دیا۔ (العلم والعلماء ۲۳۶)۔

امام وقت عبداللہ بن مبارکؒ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام کے سفر میں میں نے کسی سے ایک قلم عاریت کے طور پر لیا پھر اسے واپس کرنا بھول گیا۔ جب واپس اپنے وطن "مرو" پہونچا تو دیکھا کہ وہ قلم میرے ساتھ آگیا، تو میں دوبارہ سفر کر کے شام گیا اور قلم کے مالک کو اس کا قلم واپس کیا (حالانکہ اس زمانہ میں یہی لکڑی کے قلم ہوتے تھے، قیمتی قلموں کا تصور بھی نہ تھا) آپ کا مشہور مقولہ ہے کہ "شبہہ کے مال کا ایک درہم رد کرنا میرے نزدیک چھ لاکھ درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ (مقدمہ کتاب الزہد ۴۵)

یہ اللہ کے مقبول بندوں کے ورع و تقویٰ کی چند جھلکیاں ہیں جن سے بآسانی

اس نتیجہ تک پہونچا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کو اپنے بلند منصب کا کس قدر خیال تھا اور انھوں نے اپنی دینی عزت بچانے کے لئے کس قدر خواہشات اور لذتوں اور راحتوں کو ترک کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی خدمات میں ایسی برکتیں ظاہر ہوئیں کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ بعد کے لوگوں میں سے بھی جن خوش نصیب حضرات نے ان پاکباز نفوس کی زندگیوں کو رہنما بنایا اور ان کی صفات اپنانے کی کوششیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھی قبولیت کے دروازے کھول دیئے۔

حضرت میاںجی نور محمد جھنجھانویؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک شخص نہایت ... خوش گلو تھے اور نعت وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ کسی نے حضرت میاں جیؒ سے عرض کیا کہ حضرت یہ صاحب بڑے خوش آواز ہیں ان سے نعت سن لیجئے۔ آپ نے کمال احتیاط کا مظاہرہ فرماتے ہوئے جواب دیا کہ "لوگ مجھے کبھی کبھی امام بنا دیتے ہیں اور غناء بلا مزامیر کے اندر بھی علماء کا اختلاف ہے۔ اس لئے اس کا سننا خلاف احتیاط ہے۔ لہٰذا میں اس کے سننے سے معذور ہوں۔ (ارواح ثلثہ ۱۹۱)۔

ہمارے اکابر میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر ورع وتقویٰ میں ضرب المثل تھے۔ ان کی انتہائی احتیاط کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ جب کسی کرایہ کی سواری پر سوار ہونے کا ارادہ فرماتے تو سوار ہونے سے پہلے مالک کو اپنا سارا سامان دکھا دیتے تھے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اپنا خط بھی لاتا (کہ اسے فلاں جگہ دیدینا) تو فرما دیتے کہ بھائی میں نے سارا اسباب مالک کو دکھا دیا ہے اور یہ اس میں نہیں ہے لہٰذا تم مالک سے اجازت لے لو۔ (ارواح ثلثہ ۲۱۳)۔ یہ احتیاط آپ کی طبیعت میں اس قدر رچ اور بس گئی تھی کہ حرام کے شبہہ والے لقمہ کو بھی آپ کا معدہ قبول نہ کرتا تھا۔ اگر کبھی

بھول یا غلطی سے مشتبہ مال کھا بھی لیتے تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں آپ نے کئی سال سالن سے روٹی نہ کھائی۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ دہلی کے اکثر سالنوں میں کھٹائی پڑتی ہے۔ اور آموں کی بیع ناجائز طریقہ پر ہوتی ہے اس لئے میں سالن نہیں کھاتا۔ (ارواح ثلثہ ۲۱۸)۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو حرام اور مشتبہ کھانے سے نفرت تھی اور اس کا احساس بھی بہت جلد فرما لیتے تھے۔ دلداری کی وجہ سے گو کہ ہر ایک کی دعوت قبول فرما لیتے لیکن اگر حرام کا شبہہ ہوتا تو واپس آکر قے فرما دیتے۔ (ایضاً ۲۵۰)

قطب العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب آپ کی عمر پچیس سال کی ہوئی اور آپ اپنی موروثی جائیدادوں کے متصرف اور وارث ہوئے تو آپ نے سارے کاغذات کو ملاحظہ فرمایا اور آپ کے دادا نے (جو زیادہ متشرع نہ تھے) رہن کی جو زمینیں قبضہ میں کر رکھی تھیں اور ان سے آمدنی حاصل کی جا رہی تھی۔ ان سب کی آمدنیوں کا حساب لگایا۔ اور اصل مالکوں کو نہ صرف یہ کہ ان کی زمینیں واپس کر دیں بلکہ اگر ان زمینوں سے قرض کی رقم سے زائد آمدنی ہوئی تھی تو اسے بھی اصل مالکوں کو لوٹا دیا اور اس سلسلہ میں اپنا مال خرچ کیا۔ حتیٰ کہ اہلیہ کا زیور بھی بیچ ڈالا تاکہ ناحق اور حرام آمدنی سے حفاظت ہو اور دوسروں کا حق اپنی گردن پر نہ رہے۔ (بیس بڑے مسلمان ۱۶۲، تذکرۃ الرشید ۷۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی زندگی میں ورع وتقویٰ کی ایسی مثالیں اور نمونے پیش فرمائے ہیں جو بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے واقعی مینارۂ نور اور ذریعہ ہدایت ہیں۔ آپ سفر میں مقررہ وزن سے زائد سامان بغیر محصول ادا کئے ہرگز نہ لے جاتے۔ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور

جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے۔ آپ انھیں اسٹیشن پر تلوانے لگے تو ریلوے کا کوئی ملازم تولنے پر تیار نہ ہوا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم بھی کہنے لگے کہ حضرت اسے تلوانے کی ضرورت نہیں، ویسے ہی لے جائیے، ہم گارڈ سے کہدیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ جواب ملا کہ یہ غازی آباد تک جائے گا اور وہاں دوسرے گارڈ سے کہدیگا جو آپ کے ساتھ کانپور تک جائے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہوجائیگا آپ فرمانے لگے بلکہ وہاں میرا سفر ختم نہ ہوگا بلکہ آگے ایک سفر آخرت بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہوگا۔ (بیس بڑے مسلمان ۳۵۳)

افسوس آج ایسے اہل تقویٰ کے دیدار کو آنکھیں ترستی ہیں۔ بے ٹکٹ سفر کرنا اور محصول ادا کئے بغیر سامان لانا لے جانا معیوب نہیں بلکہ کمال سمجھا جاتا ہے اور قطعًا اس کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ بھی حق تلفی ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کسی ٹی ٹی اور ریلوے ملازم کو کچھ پیسے دے کر بلا ٹکٹ سفر کرنا بھی جائز نہیں ہے ایک مرتبہ ایک غریب طالب علم حضرت تھانویؒ کے ساتھ ٹکٹ لئے بغیر ٹرین پر سوار ہوگیا۔ اگلے اسٹیشن پر جب وہ گارڈ سے ٹکٹ لینے گیا تو گارڈ نے کہدیا کہ تم غریب آدمی ہو ویسے ہی سفر کرلو۔ ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے یہ بات حضرت تھانویؒ سے آکر نقل کردی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ گارڈ، ریلوے کمپنی کا مالک نہیں ہے بلکہ ملازم ہے۔ لہذا اسے یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی مسافر کو بلا ٹکٹ ریل پر سوار کرے۔ اس لئے جاؤ اور ٹکٹ لے کر سفر کرو۔ (بیس بڑے مسلمان ۳۵۳)

اسی طرح نچلے درجہ کا ٹکٹ لے کر اوپر کے درجہ میں سفر کرنا، نیز اگر کسی کو پاس ملا ہو تو اس کے ذریعہ قانونی اجازت سے زیادہ افراد کو مفت سفر کرانا یا مدت ختم ہوجانے کے بعد اس سے سفر کرنا، یہ سب چیزیں شرعًا جائز نہیں ہیں اور جذبۂ ورع و تقویٰ کے خلاف اور مقام مقبولیت کے منافی ہیں۔ اگر کبھی سفر میں

ایسی صورت پیش بھی آجائے تو حساب لگاکر بعد میں زائد رقم کے ٹکٹ خرید کر ضائع کر دینے چاہئیں۔ تاکہ حکومت کے خزانے تک استحقاقی رقم پہونچ جائے۔

شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے کمال ورع وتقویٰ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی (گلی قاسم جان) میں تشریف فرما تھے۔ نماز عصر کا وقت آیا تو خدام نے جماعت کی غرض سے چٹائیاں بچھادیں۔ حضرتؒ جب نماز کے لئے باہر تشریف لائے اور نئی چٹائیوں پر نظر پڑی تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی طرف مخاطب ہو کر پرمسرت لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ ناظم اعلیٰ صاحبؒ نے بہت اچھا انتظام فرمایا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ ناظم صاحب کا انتظام نہیں بلکہ آپ کے خادم چودھری عبد الرحمٰن کی عقیدت ہے جو کہ چٹائیاں فروخت کرتے ہیں۔ انھوں نے ہی اس وقت (فروخت کی) چٹائیاں بچھادی ہیں۔ یہ بات سن کر حضرتؒ کا چہرۂ انور متغیر ہوگیا۔ اور اپنی جگہ سے ہٹ کر فرمایا کہ "ان چٹائیوں کو اٹھادو"۔ خدام نے عرض کیا کہ عبد الرحمٰن نے اپنی خوشی سے بچھائی ہیں۔ حضرت نے فرمایا نہیں وہ ان کو غیر مستعمل بتاکر فروخت کرے گا۔ چنانچہ چٹائیاں اٹھادی گئیں اور دفتر کی چٹائیوں پر نماز ادا کی گئی۔ (حیرت انگیز واقعات ۷۹)۔

آپ باوجودیکہ جمعیۃ علماء ہند کے بااختیار صدر تھے۔ لیکن کبھی اپنے ذاتی استعمال کے لئے جمعیۃ علماء کا لیٹر ہیڈ استعمال نہ فرماتے بلکہ آپ اپنے لئے نہایت عمدہ کاغذ کا لیٹر ہیڈ خود اپنے مصارف سے تیار کرواتے تھے۔ اسی پر خطوط لکھتے۔ بلکہ جمعیۃ علماء کے متعلق امور بھی اپنے ہی کاغذ پر رقم فرماتے۔ اپنا ذاتی خرچ آپ نے کبھی جماعت پر نہیں ڈالا۔ اور اپنے خدام کو تاکید فرماتے رہے کہ "جماعتی اور غیر جماعتی خرچ میں ہمیشہ امتیاز رکھا جائے۔ (حیرت انگیز واقعات ۷۹)

دارالعلوم دیوبند میں درس کے دوران حضرت مدنیؒ نے ایام درس کے علاوہ کبھی ایک دن کی تنخواہ بھی مدرسہ سے نہ قبول فرمائی ۔ حتی کہ استحقاقی اتفاقیہ اور علالت کی رخصتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ بلکہ بسا اوقات مدرسہ کے کام کے سلسلہ میں سفر فرماتے تو بھی سفر کے ایام کی تنخواہ نہ لیتے تھے ۔ (حوالہ بالا ۸۰)

مدرسہ کے مال میں احتیاط

ہمارے اکابر رحمہم اللہ اگرچہ دینی خدمات انجام دینے کے لئے مدارس سے متعلق رہے، اور ضرورت کی بنا پر ان کی انتظامی ذمہ داریاں بھی انجام دیں لیکن مدارس کے اموال اور املاک کے بارے میں جس قدر احتیاط برتی، آج اس کی مثالیں ملنی مشکل ہیں ۔ درحقیقت اسی احتیاط اور ورع و تقویٰ نے ان کی خدمات کو قبولیت کے اعلیٰ مقام تک پہونچا دیا تھا ۔ ان کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہونی چاہئیں ۔ ذیل میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قیمتی ملفوظ نقل کیا جاتا ہے جس سے حضرات اکابرؒ کی زندگیوں کی ایک جھلک معلوم ہو سکتی ہے ۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

" مدرسہ کا مال جو ہے بہت خطرناک ہے ۔ بڑے حضرت (مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ) رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اور کسی کام سے نہیں لگتا ۔ اس وجہ سے کہ ہم مدرسہ کے مال کے مالک نہیں ہیں، امین ہیں ۔ ہمارے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا ۔ اپنے تعلق کی وجہ سے اگر کسی کی خیانت کو معاف کرو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے ۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں شروع زمانہ میں بھٹیارے کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا ۔ جامع مسجد کے پاس ایک اسمٰعیل نامی بھٹیارا تھا جو بہت نیک تھا ۔ جامع مسجد سے مدرسہ تک لاتے ہوئے (کھانا) ٹھنڈا ہو جاتا تھا ۔

والد صاحب کھانے کو مدرسہ کے حمام کے قریب رکھوا دیتے تھے جس سے وہ گرم ہو جاتا تھا تو والد صاحبؒ مہینہ کے اختتام پر ایک روپیہ مدرسہ میں امداد کے نام پر جمع کروا دیا کرتے تھے کہ یہ وقف کے مال سے انتفاع ہوا ۔ ایک معمول حضرت سہارنپوریؒ کا سنا ہے اگرچہ دیکھا نہیں وہ یہ ہے کہ مدرسہ میں صدر مدرس کے لئے قالین بچھایا جاتا تھا ۔ حضرت جب سبق سے فارغ ہو جاتے تو قالین پر سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاتے جب حضرت اقدس شیخ المشائخ الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ بخاری، ترمذی کتب حدیث کے محشی اور مشہور عالم محدث ہیں ۔ جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے، کہ وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کے آمد و رفت کا مفصل حساب مدرسہ میں داخل کیا تو وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا ۔ اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتہ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا ۔ اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میرے سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی اس لئے وہاں کی آمد و رفت کا اتنا کرایہ آمد و رفت سے وضع کر لیا جائے ۔

میرے پیارو ! ان ہی چیزوں کی وجہ سے مدرسہ اس درجہ پہونچا ہے ۔ تم تقویٰ اختیار کرو گے تو مدرسہ کے مال میں احتیاط رہے گی ۔ یہ نہ سمجھو کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ۔ اس سے خلاصی نہیں ہوگی ۔ حقوق العباد کی معافی اللہ کے یہاں نہیں ہوتی ۔ کہ یہ بڑی سخت چیز ہے ۔ جیسے تو اللہ کا بندہ ہے، جس کا حق مارا ہے وہ بھی اللہ کا بندہ ہے ۔ دو پیسے کے مقابلہ میں سات سو مقبول

نمازیں لے لی جائیں گی۔ اگر اتنی نمازیں مقبول نہیں ہیں تو اس کے بقدر گناہ سر پر ڈال دیئے جائیں گے۔

میرے پیارو! حقوق العباد سے بہت ڈرتے رہو۔ اللہ جل شانہ کے فضل و کرم سے اور میرے حضرت رائے پوریؒ کی برکت سے مجھے پہلے ہی دن سے تنخواہ سے وحشت ہوگئی تھی۔ حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ اللہ توفیق دے تو مدرسہ کی تنخواہ چھوڑ دیجیو۔ اللہ کا شکر ہے جو لی تھی وہ بھی ادا کر دی۔ میرے اکابر کا معمول مدرسہ کے معاملہ میں بہت احتیاط کا رہا ہے۔ تمہارے اوپر مدرسہ کا کوئی جانی و مالی حق باقی نہ رہے۔ تم تو یہی سوچو، ہمیں مدرسہ کے معاملہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ باقی تمہارا کوئی حق مدرسہ پر رہ گیا ہو تو اسکا خیال نہ کرو، اللہ کے یہاں بہت کچھ ملے گا۔ ملفوظات شیخ (۱۶۱،۲۶۲)۔

ایک دوسرے ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ہمارے یہاں مظاہر علوم میں سالانہ جلسہ میں مدرسین حضرات کھانا مدرسہ کے کھانے میں سے نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ اپنے اپنے گھروں سے منگا کر کھاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ناظم صاحبؒ مطبخ کے سالن کی جانچ جو طلبہ کے لئے بنتا تھا خود نہ چکھتے تھے بلکہ کسی طالبعلم ہی سے چکھواتے تھے۔ اسی طرح مدرسہ کے مہمانوں کے لئے جو پان بنتے تھے اس میں سے نہیں کھاتے تھے بلکہ اپنے گھر سے منگواتے تھے۔ بعض دفعہ مہتمم صاحب تین تین دن مدرسہ میں رہتے۔ ان کا کھانا گھر سے آتا تھا، معمولی سالن دال ہوتی، ایک طرف بیٹھ کر ٹھنڈا کھا لیتے تھے۔ جلسہ میں شرکت کے لئے حضرت مدنی حضرت رائے پوری رحمہا اللہ تشریف لاتے تو یہ میرے خصوصی مہمان بنتے، مدرسہ کا کھانا نوش نہ فرماتے۔

(ملفوظات شیخ ۱۶۴)

حضرات اکابر اولیاء اللہؒ کے طرز عمل کو سامنے رکھکر ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ خود ہمارا ورع و تقویٰ کس معیار کا ہے اور خاص کر مدارس اور قومی و ملی اداروں کی آمدنیوں میں کس قدر لاابالی پن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور اپنے ذاتی مفادات کس طرح قومی ملکیت سے استحقاق سے زیادہ حاصل کئے جاتے ہیں، اس جانب سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔ ہمارا مزاج یہ بنتا جا رہا ہے کہ ہم چاہے ادارے کا کچھ حق ادا کریں یا نہ کریں ہمیں ہمارا حق بلا کم و کاست بلکہ ضابطہ سے بھی زیادہ ملنا چاہیئے۔ آج مدارس میں تعلیمی انحطاط کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمیں اپنے حقوق کی فکر تو ہے، مگر فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی عام ہوگئی ہے۔ اوقات درس کا اتنا اہتمام نہیں ہے جتنا ہونا چاہیئے۔ استاد جیسا کرتے ہیں طلباء کا بھی وہی مزاج بن جاتا ہے۔ اس لئے خود ہمیں ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیئے جو ہمارے شاگردوں کے لئے بھی راہ نما اور لائق تقلید ہو۔ مشہور بزرگ حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہ کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص دوران درس ویسے ہی بات چیت کرنے آتا تو فوراً گھڑی دیکھتے کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر آیا ہے اور جب وہ بات کر کے واپس جاتا تو پھر گھڑی دیکھتے۔ اور یہ پورا وقت ایک کاغذ پر جو حضرت کی کتاب میں رکھا رہتا تھا لکھ لیتے اور مہینے کے ختم پر روزانہ کا حساب جمع کرتے۔ اور جتنے گھنٹے اور دن بنتے اس کی اطلاع دفتر میں بھیج دیتے۔ کہ اتنے گھنٹے یا اتنے دن کی میری تنخواہ وضع کر لی جائے۔ (ملفوظات فقیہ الامتؒ ۱؍۹۴)۔

ذرا غور فرمائیں کیا اوقات کا یہ اہتمام ہماری زندگیوں میں پایا جاتا ہے؟ اگر اس میں کوتاہی ہے تو ہمیں جلد از جلد اس نقص کو دور کرنا چاہیئے۔ ورع و تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

خوف وخشیت

قاسم بن محمدؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ سفر میں جا رہے تھے۔ تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آخر کیا بات ہے جس کی بنا پر یہ عبداللہ بن مبارکؒ ہم سب پر فائق ہیں اور لوگوں میں شہرت کے اِس بلند مقام پر پہونچ گئے ہیں۔ یوں تو وہ بھی ویسی ہی نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں، یہی حال روزہ، جہاد اور حج کا بھی ہے۔ پھر آخر ان میں کون سی خوبی ہے؟ میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک مرتبہ ہم ملک شام کے راستہ میں ایک گھر میں کھانا کھانے بیٹھے کہ اچانک چراغ گل ہو گیا۔ ہم میں سے ایک ساتھی باہر چراغ لینے گیا۔ جب وہ چراغ لے کر واپس آیا اور چراغ کی روشنی میں میری نظر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے چہرے پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کی پوری داڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ اسی خوف وخشیت کی وجہ سے عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ مقام مقبولیت حاصل ہوا ہے۔ شاید انھوں نے اندھیرے سے قیامت کی اندھیریوں کا تصور کر لیا ہو گا جس کی بنا پر رقت طاری ہو گئی۔ (مقدمہ کتاب الزہد ۴۵)۔

مقبولیت عنداللہ کے لئے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا لازم ہے۔ بغیر خوف و خشیت کے انسان گناہوں سے بچ نہیں سکتا۔ اور جو گناہوں سے نہ بچ سکے وہ خواہ کتنا ہی مقبولیت کا ڈھونگ رچائے، حقیقی مقبولیت کی ہوا بھی نہیں پا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ خوف وخشیت نہایت قابل قدر ہے۔ قرآن کریم میں اہل جنت کی جو اہم صفات بیان کی گئی ہیں ان میں خوف وخشیت کی صفت بھی امتیازی شان رکھتی ہے سورہ والنّٰزعٰت میں فرمایا گیا۔

وامّا من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى المأوى	اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہو گا اور نفس کو خواہش سے روکا ہو گا سو جنت اس کا ٹھکانا ہو گا۔

اور سورہ مومنون میں ارشاد فرمایا گیا۔

ان الذین هم من خشیة ربهم مشفقون،	البتہ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح اصحابِ معرفت علماء کا وصف خاص یہ بیان کیا گیا۔

انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء،	اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عالم وہ شخص ہے جو خلوت اور جلوت میں اللہ سے ڈرے اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے وہ اس کو مرغوب ہو اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہو اس کو اس سے نفرت ہو (معارف القرآن ۷/۳۴۷) ربیع بن انسؒ نے فرمایا کہ جس کے دل میں اللہ کی خشیت نہ ہو وہ عالم کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ (قرطبی ۷/۳۰۷)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بہت سی باتیں بیان کر دینے کا نام علم نہیں بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ خشیت کی زیادتی ہو۔ (معارف القرآن ۷/۳۴۷)۔ سفیان ثوریؒ کا مقولہ ہے کہ اللہ کا خوف ہی انسان کو عبادت کا حوصلہ اور قوت بخش سکتا ہے۔ (العلم والعلماء ۲۵۸)

اللہ تعالیٰ کی خشیت سے دل نرم ہو جاتے ہیں جس کا اظہار گرم گرم آنسوؤں سے ہوتا ہے۔ پھر یہ آنسو کے قطرات زندگی بھر کے گناہوں کی آگ کو لمحوں میں بجھا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خشیت کے اثر سے نکلے ہوئے آنسو کے قطرے بڑے محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اللہ کی خشیت سے اس کی آنکھیں بھر آئیں، یہاں تک کہ زمین پر اس کے آنسو گر پڑے تو اس کو قیامت میں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (الترغیب والترہیب ۴/۲۲۹)

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص اللہ کے خوف

سے رویا ہوگا وہ جہنم میں نہ داخل ہوگا۔ یہاں تک کہ جانور کے تھن سے نکلا ہوا دودھ دوبارہ تھن میں نہ چلا جائے۔ (یعنی جس طرح تھن میں دوبارہ دودھ جانا مشکل ہے اسی طرح اس شخص کا جہنم میں جانا بھی مشکل ہے۔ (الترغیب ۴/۲۲۹) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی افمن هذا الحدیث تعجبون وتضحکون ولا تبکون، (کیا اس بات سے تم تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو) تو اسے سنکر "اصحاب صُفّہ" اتنا روئے کہ ان کے آنسو ان کے چہروں اور رخساروں پر بہنے لگے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آواز سنی تو آپؐ کو رونا آگیا اور آپ کو روتا دیکھ کر ہم سب اہل مجلس بھی گریہ وبکا میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ڈر سے رونے والا جہنم میں نہ جائے گا اور گناہ پر اصرار کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا اور اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ کریگی پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ (تاکہ اللہ تعالیٰ کی صفت غفاری کا ظہور ہو) (الترغیب والترہیب ۴/۲۲۹)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ صفت خشیت سے متصف تھے۔ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا کہ رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے ایسی آواز آرہی تھی گویا کہ چکی چل رہی ہو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایسی آواز تھی گویا کہ دیگچی میں کوئی چیز پک رہی ہو۔ (الترغیب ۴/۲۳۲)۔

امیر المومنین سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انتہائی رقیق القلب تھے۔ اور ساتھ میں خوف وخشیت کا حال یہ تھا کہ کبھی فرماتے کہ کاش میں ایک پودا ہوتا، جسے کاٹ دیا جاتا۔" کبھی اپنی زبان کو پکڑ کر فرماتے کہ اسی نے مجھے خطرہ کے مواقع

پر لا کھڑا کیا ہے"۔ (العلم والعلماء ۱۴۶)۔

امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قدر روتے تھے کہ آپ کے چہرۂ انور پر آنسوؤں سے دو کالی دھاریاں بن گئی تھیں۔ کبھی آپ زمین سے تنکا اٹھاتے اور فرماتے کاش میں یہ تنکا ہوتا، کاش میری پیدائش ہی نہ ہوئی ہوتی۔ کاش میری ماں نے مجھے جنا نہ ہوتا۔ کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا، کاش میرا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ آپ کا یہ مقولہ مشہور تھا کہ اگر میدان حشر میں اعلان ہونے لگے کہ اے لوگو! ایک آدمی کے سوا تم سب لوگ جنت میں چلے جاؤ تو مجھے خطرہ ہے کہ وہ آدمی شاید میں ہی ہوں۔ اور اگر یہ اعلان ہونے لگے کہ اے جہنمیو! ایک آدمی کے سوا تم سب جہنم سے نکل جاؤ تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ایک آدمی میں ہی ہوں گا۔ (العلم والعلماء ۱۶۵)

سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شدت خشیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ زید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اتنا روئے کہ میں نے خود دیکھا کہ آپ اپنے آنسوؤں کو چلو میں بھر بھر کر دوسری طرف ڈال رہے تھے۔ (العلم والعلماء ۲۰۱)۔

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ جب وضو فرماتے تو آپ کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ گھر والے پوچھتے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تو آپ جواب دیتے کہ تمھیں کیا پتہ کہ میں کس کے سامنے کھڑے ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کپکپی طاری ہو جاتی۔ پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمھیں پتہ نہیں میں کس کے سامنے کھڑا ہو کر مناجات کرونگا۔ (العلم والعلماء ۲۷۴)

خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک مرتبہ روئے۔ انھیں دیکھ کر ان کی اہلیہ فاطمہ بھی رونے لگیں۔ اور دیگر گھر کے لوگ بھی رونے لگے۔ مگر کسی کو پتہ نہ تھا کہ کیا چیز رلانے کا سبب بنی؟ جب افاقہ ہوا تو فاطمہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

سے پوچھا کہ امیرالمومنین! آپ کس وجہ سے روئے تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ تصور آگیا تھا۔ کہ ایک دن ساری کائنات کے لوگ اللہ رب العزت کے سامنے حاضر ہونگے اور ان میں ایک فریق جنتی ہوگا اور ایک جہنمی' اور یہ فرما کر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑے (العلم والعلماء ۲۸۷)۔

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے رونے کی آواز رات میں گھر کے باہر تک سنائی دیتی۔ حتیٰ کہ آپ کے پڑوسی آپ کی حالت پر ترس کھانے لگتے۔ یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجالست و مصاحبت اختیار کی جب میں آپ کے چہرے کو دیکھتا تھا تو فوراً مجھے احساس ہو جاتا تھا کہ وہ اللہ رب العزت سے ڈرنے والے ہیں۔ قاسم بن معنؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات میں امام ابوحنیفہؒ نے یہ آیت پڑھی۔ بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھیٰ وامر (سورہ قمر) (بلکہ قیامت ہے ان کے وعدہ کا وقت اور وہ گھڑی بڑی آفت ہے اور بہت کڑوی ،) تو پوری رات نہایت گریہ وزاری کے ساتھ یہی آیت دہراتے رہے۔ (عقود الجمان ۲۲۴)۔

عبدالرزاق بن ہمام کہتے ہیں کہ میں جب بھی امام ابوحنیفہؒ کو دیکھتا تو آپ کی آنکھوں اور رخساروں پر رونے کے آثار محسوس کرتا تھا۔ یزید بن کمیتؒ جو خود بھی اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اللہ تعالیٰ سے انتہائی خشیت فرمانے والے تھے۔ ایک مرتبہ علی بن حسین موذن نے عشاء کی نماز میں سورۃ زلزال پڑھائی۔ امام ابوحنیفہؒ بھی جماعت میں شریک تھے۔ جب نماز ختم ہوئی اور لوگ چلے گئے تو میں نے امام ابوحنیفہؒ کو دیکھا کہ وہ متفکر بیٹھے ہیں اور ان کا سانس تیز چل رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہئے تاکہ ان کی یکسوئی میں کوئی خلل نہ آئے چنانچہ میں چراغ جلتا چھوڑ کر مسجد سے چلا آیا۔ پھر صبح صادق کے وقت میں مسجد پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ کھڑے ہیں اور اپنی داڑھی پکڑ کر یہ دعا کر رہے ہیں کہ

"اے وہ ذات جو رائی کے دانے کے برابر بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیتی ہے اور اے وہ ذات جو رائی کے دانے کے برابر برائی کا بدلہ برائی سے دینے والی ہے تو اپنے بندہ نعمان (ابوحنیفہؒ) کو جہنم اور جہنم سے قریب کرنے والی چیزوں سے نجات عطا فرما۔ اور اپنی وسعت رحمت میں اسے داخل فرما" (عقود الجمان ۲۲۵)۔

یحییٰ بن نصر کہتے ہیں کہ میرے والد صاحب امام ابوحنیفہؒ کے دوست تھے جس کی بنا پر میں کبھی کبھی امام صاحبؒ کے یہاں رات میں سوجاتا تھا تو میں دیکھتا کہ امام ابوحنیفہؒ پوری رات نماز میں مشغول رہتے اور میں چٹائی پر ان کے آنسوؤں کے گرنے کی آواز اس طرح سنا کرتا تھا گویا کہ بارش ہو رہی ہو۔ (عقود الجمان ۲۳۰)۔

یہ اللہ کے ان ... مقبول بندوں کے کردار کی چند جھلکیاں ہیں۔ جو اپنے دور میں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور جن کی چشم ابرو پر کتنے انسان مرمٹنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ واقعی جو اللہ سے ڈرتا ہے تو پھر ساری کائنات اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ ہمارے اکابرؒ بھی خوف وخشیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ وہ اگرچہ اپنے کمال اخلاص کی وجہ سے عام طور پر خشیت کے آثار کو لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے لیکن ان کے معاملات، طرز عمل اور زندگی کی ہر ہر ادا سے اس بات کا واضح طور پر اظہار ہوتا تھا کہ ان کا دل جذبۂ خشیت سے پوری طرح معمور ہے۔ اور وہ اپنے ہر کام میں آخرت کی باز پرس کا خیال رکھتے ہیں۔ اور کبھی کمال ضبط کے باوجود خشیت اور گریہ وبکا کا اس طرح اظہار بھی ہو جاتا۔ کہ سننے والوں کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ امام ربانی قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"سچے علم کا ثمرہ یعنی بے نیاز خدا کا خوف اور خشیت جیسا آپ کے قلب میں تھا، شاید زمانہ کی آنکھوں نے کہیں نہ دیکھا۔ مگر ضبط اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اظہار مشکل

تھا۔ جس وقت اخیر شب میں تحریمہ باندھ کر اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوتے اور ... دست بستہ عرض معروض شروع فرماتے تو آپ پر وہ حالت نمایاں ہوتی تھی جو شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہوتے وقت غلام پر ہونی چاہئے۔ بسا اوقات آپ پر گریہ طاری ہوجاتا۔ آواز بھرا جاتی، ہچکی بندھ جاتی، آنکھوں سے آنسوؤں کے تار موتیوں کی لڑیاں بن کر بہتے اور سارے بدن پر ایک رعشہ پیدا ہوجاتا تھا۔ شہنشاہی فرمان یعنی مقدس قرآن کی آیات آپ پڑھتے اور تغیر حال کے سبب رک جاتے تھے۔ پھر شروع فرماتے اور پھر ٹھہر جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک آیت شریفہ پر آپ نے صبح کردی کہ اس کو بار بار دہراتے اور اعادہ فرماتے تھے"۔ (تذکرۃ الرشید ۱۹۱)۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ انتہائی عدیم الفرصت تھے اور پورا دن درس وتدریس، ضیافت اور قومی وملی امور کی تکمیل میں گذرتا تھا لیکن باایں ہمہ نماز تہجد کی ایسی پابندی تھی کہ سفر یا حضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا اور اس وقت آپ پر ایسا گریہ وبکا کا عالم طاری ہوتا جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ "آپ بیتی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اپنے اکابر میں اپنے والد صاحبؒ اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کو اخیر شب میں بہت ہی آواز سے روتے سنا۔ بسا اوقات ان اکابر کے رونے سے مجھ جیسے کی آنکھ بھی کھل جاتی جس کی آنکھ سونے کے بعد بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ ہندی کے دوہے بڑے درد سے پڑھا کرتے تھے میں ہندی سے واقف نہیں اس لئے مضامین کا تو پتہ نہیں چلتا تھا لیکن رونے کا منظر اب تک کانوں اور دل میں ہے۔ جیسے کوئی بچہ کو پیٹ رہا ہو اور وہ رو رہا ہو۔ (آپ بیتی ۴/۱۰۶)

فدائے ملت حضرت اقدس مولانا سید اسعد صاحب مدنی دامت برکاتہم حضرت شیخ الاسلامؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "آپ اخیر شب میں اپنے کمرے میں تشریف لاکر تہجد میں مصروف ہوجاتے۔ اگر میرا کبھی اس وقت آپ کے کمرے میں جانا ہوا تو اکثر آپ کو زار و قطار روتے دیکھا۔ پاس ہی تولیہ رکھا رہتا تھا وہ اس طرح تر ہوجاتا تھا کہ جیسے کسی نے اسے ابھی دھو کر ڈال دیا ہو۔ (حیرت انگیز واقعات ۸۴)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب علم حقیقی کی علامت خشیت اللہ ہے تو ہر عالم یا طالب علم کو بار بار اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ یہ علامت اس میں پیدا ہوئی یا نہیں، اور مثال دے کر فرماتے کہ جب کوئی مسافر ریل گاڑی میں سوار ہوکر کسی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو وہ بار بار کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھتا ہے کہ اب کون سا اسٹیشن آیا ہے؟ اگر وہی اسٹیشن راستے میں پڑ رہے ہیں جو منزل مقصود کے راستے میں آیا کرتے ہیں تو مطمئن ہوجاتا ہے۔ اور انہی اسٹیشنوں سے اندازہ لگاتا ہے کہ منزل کتنی دور ہے؟ اور اگر اسٹیشن ایسے نامانوس آنے لگیں جو اس منزل کے راستے میں نہیں پڑتے تو سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی کسی اور رخ پر جارہی ہے اور گھبرا کر گاڑی بدلنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح علم کے مسافر کو بار بار اپنے دل کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ "خشیت اللہ" کا اسٹیشن آیا یا نہیں۔ اگر اس اسٹیشن کے کچھ آثار معلوم ہوتے ہیں تو سفر صحیح سمت میں ہو رہا ہے۔ لیکن اگر خشیت، تواضع، انابت الی اللہ اور اتباع سنت کے بجائے بے فکری، تکبر وانانیت حب جاہ ومال اور نفس پرستی کے اسٹیشن آرہے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کسی غلط گاڑی میں سوار ہے۔ اور یہ گاڑی اسے علم کی اس منزل تک نہیں پہونچا سکتی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب ہے۔ (میرے والد میرے شیخ ۱۴۸)

اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ دعا تلقین فرمائی ہے۔

اللھم اقسم لنا من خشیتک ما　　اے اللہ ہمیں اپنا اتنا خوف نصیب فرما جس کی وجہ

تحول بہ بیننا وبین معاصیك	سے تو ہمارے درمیان اور اپنی نافرمانیوں کے
ومن طاعتك ماتبلغنا بہ جنتك ومن	درمیان حائل ہوجائے اور اپنی اتنی فرمانبرداری
الیقین ماتھون بہ علینا مصائب الدنیا	عطا فرما جس کے سبب تو ہم کو اپنی جنت تک پہونچادے

اور وہ یقین دے جس کی وجہ سے تو دنیا کی مصیبتوں کا جھیلنا ہم پر آسان کردے ۔ آمین ۔

خاتمہ

اخیر میں علماء اور صوفیاء کے اخلاق کے متعلق قطب العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی ایک جامع تحریر پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے ۔ حضرتؒ فرماتے ہیں ۔ :

"صوفیہ کے اخلاق وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے ۔ حسب فرمانِ خداوندی کہ " بیشک تم بڑے خلق پر پیدا کئے گئے ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے ان پر عمل اخلاق صوفیہ میں داخل ہے ۔ صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے ۔ ۱ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تکبر ۔ ۲ مخلوق کے ساتھ تلطف کا برتاؤ کرنا اور خلقت کی ایذاؤں کو برداشت کرنا ۔ ۳ نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا اور غیظ وغضب کو چھوڑ دینا ۔ ۴ ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا خلق پر شفقت کے ساتھ ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے حظ نفسانی پر مقدم رکھا جائے ۔ ۵ سخاوت کرنا ۔ ۶ درگذر اور خطا کا معاف کرنا ۔ ۷ خندہ روئی اور بشاشت جسم ۔ ۸ سہولت اور نرم پہلو رکھنا ۔ ۹ تصنع اور تکلف چھوڑ دینا ۔ ۱۰ خرچ کرنا بلا تنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج

لاحق ہو ۔ ۱۱ خدا پر بھروسہ رکھنا ۱۲ تھوڑی سی دنیا پر قناعت کرنا ۔ ۱۳ پرہیزگاری اختیار کرنا ۔ ۱۴ جنگ وجدل اور عتاب نہ کرنا مگر حق کے ساتھ ۔ ۱۵ بغض وکینہ وحسد نہ رکھنا ۔ ۱۶ عز وجاہ کا خواہشمند نہ رہنا ۱۷ وعدہ پورا کرنا ۔ ۱۸ بردباری ۔ ۱۹ دور اندیشی ۔ ۲۰ بھائیوں کے ساتھ موافقت اور محبت اور اغیار سے علیحدہ رہنا ۔ ۲۱ محسن کی شکرگزاری ۔ ۲۲ اور جاہ کا مسلمانوں کے لئے خرچ کرنا ۔ صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر وباطن مہذب بنا لیتا ہے ۔ اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے ۔ بارگاہِ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے منہ پھیر لیا جائے ۔ شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال وہیئت کے سبب بدترین معصیت تحدیث نفس یعنی نفس سے باتیں کرنا ہے اور ظلمت کا سبب ہے ۔"

(تاریخ مشائخ چشت ۲۹۳)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے مقبول بندوں کے اخلاق واعمال اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ اور دنیا وآخرت میں اپنی مرضیات سے سرفراز فرمائے ۔ آمین ۔

اللھم انعشنی واحینی وارزقنی واھدنی لصالح الاعمال والاخلاق انہ لایھدی لصالحھا ولا یصرف سیئھا الا انت ۔ (حاکم عن ابی ایوب ۔ مناجاۃ مقبول) ۔

برحمتك یا ارحم الراحمین ۔ آمین ۔

اہلِ علم، علماء و طلباء کیلئے مفید اور کارآمد باتیں

کچھ نصیحتیں اور کچھ مشورے

افادات: حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

- فرمایا: ایک بات اہلِ علم کے کام کی بتلاتا ہوں کہ دین پر عمل کرنے کا مدار سلف صالحین کی عظمت پر ہے۔ اس لئے حتی الامکان ان پر اعتراض اور تنقیص کی آنچ نہ آنے دینا چاہیئے۔
- مولوی ہونا کوئی خوشی کی بات نہیں، دیندار ہونا خوشی کی بات ہے۔ زیادہ کھانے سے جسم تازہ اور قلب مکدر رہتا ہے اور کم کھانے سے جسم کمزور ہوجاتا ہے مگر قلب کو تازگی ہوتی ہے
- علم اور اس کے ساتھ صحبت کی بڑی ضرورت ہے۔ صحبت سے واقفیت بھی ہوتی ہے اور عمل کے ساتھ مناسبت بھی ہوتی ہے۔ بڑی ضرورت ہے شیخ کی، نری کتابیں کافی نہیں۔
- مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے سے زیادہ گُننا (سمجھنا) چاہیئے۔ ایک شخص پڑھا ہوا ہے اور ایک گُنا (سمجھا) ہوا، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ گُننا صحبت سے آتا ہے
- علماء کا ہمیشہ غریب ہی رہنا اچھا ہے، جس قوم اور جس مذہب کے علماء امیر ہوئے وہ مذہب برباد ہوگیا۔
- آدمی قناعت پر اکتفاء کرلے اور ضروری سامان کے ساتھ رہے تو تھوڑی آمدنی میں بھی رہ سکتا ہے اور فرض منصبی کو بھی ادا کرسکتا ہے۔

- دو چیزیں اہلِ علم کے واسطے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہیں۔ حرص اور کبر۔ یہ ان میں نہیں ہونا چاہیئے۔
- مناسب ہے کہ پنسل اور کاغذ جیب میں پڑا رہے۔ جس وقت جو مضمون ذہن میں آئے اس کا اشارہ لکھ لیا جائے۔ پھر دوسرے وقت ان میں ترتیب دیدی جائے۔ چنانچہ میری جیب میں پنسل اور کاغذ پڑا رہا ہے۔ ورنہ بعض مضامین ذہن میں آتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں۔
- امام مالکؒ کی خدمت میں ایک بزرگ نے لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ عمدہ کپڑے پہنتے ہیں، بزرگوں کی کیا یہی شان ہوتی ہے؟ حدیثیں موجود تھیں، اگر چاہتے تو ثابت کر دیتے، مگر یہ فرمایا نعم نفعل ونستغفر، یعنی ہم کرتے ہیں اور اپنے کو گنہگار سمجھ کر استغفار کرتے ہیں، کوئی تاویل نہیں کی۔
- کثیر الاشغال شخص کو زبانی یاد پر اکتفاء نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ضروری کاموں کو لکھ لینا چاہیئے۔
- تحمل سے زیادہ کبھی اپنے ذمہ کام نہ لو۔
- بیکار وقت کھونا نہایت برا ہے۔ اگر کچھ کام نہ ہو تو انسان گھر کے کام میں لگ جائے گھر کے کام میں لگنے سے دل بہلتا ہے اور عبادت بھی ہے۔ مجمعوں میں بیٹھنا خطرہ سے خالی نہیں، کسی کی حکایت بعض مرتبہ غیبت کی نوبت آجاتی ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔
- ملنے جلنے میں ہزارہا مفاسد ہیں۔ اختلاط سے سینکڑوں بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں بس اپنے اپنے کام مشغول رہنا چاہیئے۔

○ ایک آدمی سب کو خوش رکھے، یہ ہو نہیں سکتا، جب ہر حال میں اس پر برائی آتی ہے تو پھر اپنی مصلحت کو کیوں فوت کرے۔ جس کام میں اپنی مصلحت اور راحت دیکھے بشرطِ اذنِ شرعی وہی کرے۔ کسی کی بھلائی برائی کا خیال نہ کرے، مخلوق کے برا کہنے کا خیال نہ کرے، حق تعالیٰ سے معاملہ صاف رکھنا چاہیئے۔

فرمایا: دو باتیں مجھے بہت ناپسند ہیں۔ ایک تو تقریر میں لغت بولنا، دوسرے تحریر میں شکستہ لکھنا۔ کیونکہ تحریر و تقریر سے مقصود افہام ہوتا ہے اور یہاں ابہام ہوتا ہے۔

○ جس کے معتقد ہو اس کے کہنے کا برا نہ مانو۔ تھوڑی دیر کے لئے صبر کرلو، شاید یہ امتحان ہی لیتے ہوں۔ اگر وہ اس کا امتحان ہونا پہلے ہی سے تبلادیں تو پھر امتحان ہی کیا ہوا۔

○ مشغولی بڑی سلامت کی چیز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ کسی نہ کسی کام میں رکھیں۔ بس خدا جس سے کام لینا چاہیں وہی کام کرسکتا ہے۔ خود کچھ نہیں کرسکتا۔ آدمی کو اپنی کسی چیز پر ناز نہ کرنا چاہیئے، نہ علم وفضل پر، نہ عقل وفہم پر، نہ زہد وتقویٰ پر، نہ عبادت واعمال پر، نہ شجاعت وقوت پر، نہ حسن اور جمال پر۔ یہ سب حق تعالیٰ کی عطا ہیں۔ پھر ناز کس پر۔ ناز تو اپنے کمال پر ہوتا ہے۔ اور جب اپنا کمال کچھ بھی نہیں تو پھر تو نیاز کی ضرورت ہے۔ اگر نیاز نہ کرے گا تو پھر خیر نہیں۔

○ جس کے سر پر کوئی بڑا ہو اس سے پوچھ کر سب باتیں کرنی چاہیئے۔ یہ تاکید لڑکوں کو خاص طور پر رکھنا چاہیئے۔

○ بڑوں سے اگر کسی امر میں اختلاف کیا جائے تو وہ علی الاطلاق مذموم نہیں۔ اگر نیت اچھی ہو تو اس کا مضائقہ نہیں۔ ہاں اگر بڑے اس سے بھی روک دیں، تو پھر

کچھ نہ بولو اور جب تک ان کی اجازت ہو خوب بولو۔

اگر غلطی بھی (اپنے کسی بڑے مثلاً) پیر سے ہو تو مرید کو اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں باادب متنبہ کردے۔ جب دیکھے کہ خود متنبہ نہ ہوگا۔ اگر یہ امید ہو کہ متنبہ ہوجائیگا تو پھر سکوت کرے۔ اعتراض کرنا بیجا حرکت ہے۔

○ جب آدمی دین کا پابند نہ ہو اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں، کیونکہ اس کا کوئی کام حدود کے اندر تو ہوگا نہیں، دوستی ہوگی تو حدود سے باہر، دشمنی ہوگی تو حدود سے باہر۔ ایسا شخص سخت خطرناک ہوگا۔ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھنا یہی بڑا کمال ہے۔ آج کل اکثر مشائخ وعلماء میں اس کی کمی ہے، کوئی چیز ان کے یہاں اپنے درجہ پر نہیں۔

○ ایک تجربہ کی بات عرض کرتا ہوں کہ وہ نہایت نافع اور مؤثر ہے کہ کسی چیز کے درپے نہ ہونا چاہیئے، اس میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ لوگوں کو غرض کا شبہ ہوجاتا ہے کہ اس قدر کاوش کیوں ہے اس میں ضرور کوئی اس کی ذاتی غرض ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں پھر فریق بندی ہوجاتی ہے۔ پھر کوئی کام نہیں ہوتا۔ تیسرے ایک اور خرابی ہے، وہ یہ کہ شروع میں تو نیت کے اندر خلوص ہوتا ہے۔ پھر جب بات کی پچ ہوجاتی ہے تو نفسانیت بھی آجاتی ہے۔ پھر ثواب بھی نہیں ہوتا۔ اس پر لوگوں کی نظر کم جاتی ہے۔ یہ ہے باریک بات، اور حکم بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اما من استغنیٰ فانت لہ تصدیٰ۔

ایک مرض اپنی جماعت میں اور پیدا ہوگیا ہے کہ آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں، فلانے بڑھے ہوئے ہیں اور فلانے کم ہیں۔ ایک دوسرے کو فضیلت دے کر دوسرے کے عیوب بیان کرتے ہیں۔ اپنے حضرت کو دیکھا کہ مجمع میں بکثرت

لوگ ہوتے مگر یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون کس سے بیعت ہے ۔

○ میں تو اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو کسی دینی مدرسہ میں درس وتدریس کا موقع نصیب فرمائیں تو انتظام واہتمام کو اپنے لئے قبول نہ کریں۔ کیونکہ دونوں میں تضاد ہے ۔ مدرس اور علمی خدمات کرنے والوں کیلئے یہی زیبا ہے کہ اپنے اسی شغل میں لگے رہیں۔ مقامی اور ملکی سیاست سے یکسو رہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، علماء وصوفیاء وطلباء سب کو یہ وصیت فرماتے تھے کہ جس کام میں لگے ہو، وہ عبادت نماز دعاء کی ہو یا کتابوں کا مطالعہ یا درس تدریس یا وعظ پند، سب میں اس کا اہتمام رکھیں کہ اس کام کا جتنا شوق ورغبت دل میں ہے اس کو ختم تک نہ پہونچنے دیں۔ بلکہ کچھ شوق ورغبت باقی ہو اس وقت چھوڑ دیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ پھر از سر نو شوق رغبت جلد پیدا ہوگی اور کام زیادہ ہوگا ۔ اور اگر کام کو شوق ورغبت پورا کرنے اور تھکنے کے بعد چھوڑا تو دوبارہ اس کام کی رغبت وہمت بہت بہت دیر کے بعد عود کرے گی۔ اس طرح کام میں نقصان آئے گا۔

○ جس شخص کی طبیعت میں تنعم ہوتا ہے اس سے کوئی کام نہیں ہوتا۔

فرمایا چھوٹی جگہ میں رہ کر کام زیادہ ہو سکتا ہے کیونکہ وقت فراغت زیادہ ملتا ہے۔ اور بڑی جگہ میں رہ کر چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ زیادہ وقت لوگوں کی دلجوئی میں گذرتا ہے ۔ اس وقت تک جو کام ہوا ہے یہ سب اسی جگہ کی برکت ہے ۔ کام تو گمنامی ہی میں ہوتا ہے ۔

(ماخوذ از "العلم والعلماء" افادات حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

(مرتبہ: مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری، از ص ۳۶۱ تا ص ۳۶۴)

علماء کے کرنیکے چار کام

اس وقت اس (تعلیم) کے چند افراد میرے ذہن میں ہیں ان کو عرض کرتا ہوں اور وہ استقرائی چار ہیں ۔ وعظ، تدریس، امر بالمعروف خطاب خاص، تصنیف ۔ علماء کو ان چاروں شعبوں کو اختیار کرنا چاہئے ۔ اس طرح کہ طلباء کے سامنے تو مدرس بن کر بیٹھیں ۔ اور عوام کے سامنے واعظ ہوں اور خاص مواقع میں امر بالمعروف کریں ۔ اور خاص مواقع سے مراد یہ ہے کہ جہاں اپنا اثر ہو وہاں خطاب سے نصیحت کریں کیونکہ ہر جگہ امر بالمعروف مفید نہیں ہوتا ۔ اور بعض دفعہ عام لوگوں کو امر بالمعروف کرنے کی وجہ سے مخالفت بڑھ جاتی ہے جس کا تحمل ہر ایک سے نہیں ہوتا ۔ اور اگر کسی سے تحمل ہو سکے تو سبحان اللہ وہ امر بالمعروف کریں مگر یہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے سختی اور درشتی کا اظہار نہ کریں۔ بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے ۔ صرف خطاب عام پر اکتفاء کرے ۔

تین کام تو یہ ہیں ۔ چوتھا کام تصنیف کا ہے ۔ علماء کو ضرورت کے موقع پر تصنیف بھی کرنا چاہئے ۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ سب مصنف اور واعظ ہو جائیں ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بقدر ضرورت علماء میں کچھ لوگ مصنف اور واعظ بھی ہونے چاہئے ۔ اگر ایک قصبہ میں بقدر ضرورت واعظ موجود ہوں تو دوسرے علماء پر وعظ کہنا واجب نہیں ان کو درس تدریس میں مشغول رہنا جائز ہے ۔ اور اگر واعظ کوئی نہ ہو تو مولوی صاحب کو اجازت نہیں کہ وہ صرف مدرس ہی بن کر رہیں بلکہ ضرورت کے موقع پر ان کو وعظ بھی کہنا چاہئے ۔ وعظ میں خاص اثر ہوتا ہے جس سے عوام کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے ۔ نیز عوام کو اس سے وحشت بھی نہیں ہوتی بلکہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ اور اس کا جلدی اثر ہوتا ہے ۔ **الغرض** تصنیف کا نفع بھی عام نہیں اور درس کا نفع تو بہت ہی خاص ہے کہ ایک خاص

جماعت تک محدود ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ نفع عام وعظ کا ہے کہ ایک گھنٹہ میں پانچ چھ ہزار کو نفع ہو جاتا ہے تو وعظ کا نفع اتم و اعم و اسہل ہے اس لئے اس کو ضرور اختیار کرنا چاہئے۔ (العلم والعلماء ۲۵۷ تا ۲۵۹)

وقارِ علم

حضرت عیسی بن یونس رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدثین میں سے ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔ حضرت امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ جیسے حضرات ان کے استاذ ہیں۔ اسحٰق بن راہویہ جیسے حضرات ان کے شاگرد۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے والد یونس بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کا واقعہ ملا علی قاریؒ نقل فرماتے ہیں کہ جب ہارون رشید حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ آئے تو قاضی القضاۃ امام ابویوسفؒ کو حکم دیا کہ وہ شہر کے مشہور محدثین کو ملاقات کے لئے اس کے پاس لے کر آئیں۔ امام ابویوسفؒ نے تمام محدثین کے پاس پیغام بھیجا تو مکہ مکرمہ کے تمام محدثین جمع ہو گئے، مگر حضرت عبداللہ بن ادریسؒ اور حضرت عیسیٰ بن یونسؒ تشریف نہ لائے۔ ہارون رشید کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے دونوں صاحبزادوں امین اور مامون کو حضرت عیسیٰ بن یونس کے پاس بھیجا کہ ان سے احادیث پڑھ کر آئیں۔ جب یہ دونوں ان کے پاس پہونچے تو انھوں نے خوشی سے حدیث پڑھا کر انھیں واپس کر دیا۔ ہارون رشید نے اس کے صلہ میں دس ہزار درہم روانہ کئے، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہارون رشید سمجھے کہ انھوں نے دس ہزار کم سمجھ کر رد کیا ہے۔ اس لئے اس نے دوبارہ دوگنی رقم بھیج دی، جب یہ رقم حضرت عیسیٰ بن یونسؒ کے پاس پہونچی، تو انھوں نے کہا: اگر کوئی مجھے حدیث کے معاوضہ میں اس مسجد کو چھت تک سونے سے بھر کر پیش کر دے، تب بھی میں اسے قبول نہ کروں گا۔ چنانچہ ہارون رشید نے پھر رقم قبول کرنے پر اصرار نہ کیا۔ (جمع الوسائل ۲/۲۴، ۲۵۔ بحوالہ تراشے ۲۳۔ (مولانا محمد تقی صاحب عثمانی)

ضمیمہ :

مختصر تذکرہ

مقبولِ بارگاہ

عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی

نور اللہ مرقدہٗ

(المتوفی ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء بروز جمعرات)

آئندہ صفحات میں عصر حاضر کے مقبول ترین بزرگ، جنید وقت عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ کی قابل رشک زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کن صفات کے بدولت آپ کو قبولیت عنداللہ و عندالناس کا بام عروج عطا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تر واقعات ماہنامہ پیغام محمود دیوبند کے صدیق نمبر (مرتبہ: مولانا محمد طیب صدیقی) سے منتخب کئے گئے ہیں، اور شروع میں حضرت کی وفات پر لکھا گیا ندائے شاہی مرادآباد کا اداریہ مضمون ہے جو اکتوبر ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

نظر و فکر

ایسا کہاں سے لائیں

محمد سلمان منصورپوری

وہ روح جو ۷۷ سال تک غم فراق میں مضطرب رہی — وہ نفس جو سالہا سال تک آخرت کے شوق میں سرگرداں رہا۔ وہ مسافر جو ہزار فتنہ سامانیوں کے باوجود — دنیا میں رہ کر بھی — اپنے کردار سے واقعی کن فی الدنیا کعابری سبیل کا سراپا نمونہ پیش کرتا رہا۔ انسانیت کی خیر خواہی سے جس کا خمیر اٹھایا گیا۔ سادگی اور تواضع کے سانچے میں جسے ڈھالا گیا۔ ریاضت اور مجاہدہ کی بھٹی میں جسے کندن بنایا گیا — اتباع سنت کے نور سے جس کی کشادہ جبیں ضیاء بار اور اطاعت خداوی کے جذبہ سے جس کا قلب اطہر منور تھا۔ جس کی زندگی جہد مسلسل کا عنوان اور جس کی حیات مقدسہ کا ہر ہر لمحہ نفع خلائق کے لئے وقف تھا۔ جس کے پرتاثیر مواعظ سے اگر ظلمت کدوں کو روشنی ملی اور ہزاروں بے راہ روں کو ہدایت کا سرا ہاتھ آیا تو دوسری طرف سیکڑوں تشنگان علوم نبوت نے جس کے فیوض عالیہ سے جی بھر کے سیرابی کا شرف حاصل کیا جس نے اپنے بلند اور امتیازی کردار سے اسم بامسمیٰ "صدیق احمد" ہونے کا ناقابل تردید ثبوت پیش کیا۔ ۔ اور جس کی عظمت کے اعزاز میں قدم قدم پر دنیا دیدہ و دل فرش راہ کرتی رہی — وہی عارف باللہ، محبوب خلائق جنید وقت، احیاء سنت کا علمبردار۔ علوم نبوت کا عاشق حقیقی، اور نمونہ اسلاف۔ گذشتہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء بروز جمعرات دن میں ۱۰ بجکر ۱۰ منٹ پر لکھنؤ کے ایک نرسنگ ہوم میں ہزاروں جان نثاروں کو روتا، بلکتا چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی کی ذات ان مقبولان بارگاہ میں تھی جن کا محض وجود ہی عالم میں رحمت اور برکت کا باعث ہوتا ہے اور جن کی مستجاب دعائیں نہ جانے کتنے حوادث سے رکاوٹ بنی رہتی ہیں۔ حضرت قاری صاحبؒ جہاں علم و فضل کے آفتاب تھے وہیں اعمال صالحہ ورع و تقوی اور زہد و اخلاص میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ دنیا سے ایسی بے رغبتی کہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ کی نظر میں اس کی حیثیت ٹھیکروں کے برابر بھی نہیں ہے۔ سادگی ایسی کہ دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگی کا نقشہ گھوم جائے۔ اخلاق ایسے کہ ایک ہی ملاقات میں دلوں کو موم کر ڈالیں۔ مہمان نوازی کا

وہ نمونہ کہ خود مہمان حیرت میں پڑ جائے۔ طلبہ سے وہ شفقت و محبت کہ ہر طالب علم پہلی ہی نظر میں گرویدہ ہو جائے۔ ماتحتوں اور اپنے سے چھوٹوں کی وہ عزت اور حوصلہ افزائی کہ ہر شخص قدرتی طور پر دل سے ممنون و مشکور ہو جائے۔ امت کے لئے ... تڑپنے والا وہ دل جو دن رات امت کی خیر خواہی کی فکر میں مشغول رہتا۔ ہدایت و اصلاح کا وہ مخلصانہ پرجوش جذبہ جس نے آپ کی زندگی سے لفظ "آرام" گویا حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ اور آپ دن رات ایک ہی انداز میں جد و جہد اور محنت کے عادی بن گئے تھے۔ رات کی اندھیری ہو یا دن کا شور شرابہ، سفر ہو یا حضر، موسم اور حالات سازگار ہوں یا ناموافق۔ الغرض کوئی بھی چیز آپ کی نفع بخش انتھک مصروفیات کے لئے مانع نہ تھی۔

کئی ماہ سے حضرت قاری صاحبؒ کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں۔ اور بار بار یہ داعیہ پیدا ہوتا تھا کہ خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عیادت کا شرف حاصل کیا جائے۔ لیکن ابھی یہ ارادہ ہو ہی رہا تھا کہ ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء کو پونے گیارہ بجے کے قریب مدرسہ میں یہ اندوہناک خبر پہونچی کہ حضرت قاری صاحبؒ وصال فرما چکے ہیں۔ اس خبر نے تمناؤں کو حسرتوں میں بدل دیا۔ بے اختیار زبان سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" نکلا اور حضرت کا پرنور سراپا نظروں میں گھوم گیا۔ کہاں دیکھیں گی آنکھیں اب وہ حسن اخلاق اور الفت و مروت کا پیکر، وہ سادگی کا مرقع، عجز و انکساری اور تواضع و فروتنی کا نمونہ اور زہد اسلاف کی زندہ یادگار۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کی وفات سے ایسا خلاء پیدا ہوا ہے جس کی کسک امت مسلمہ عرصۂ دراز سے محسوس کرتی رہے گی۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی میں چند اوصاف بہت ہی نمایاں تھے جنھوں نے آپ کی شخصیت کو محبوب خلائق اور مقبول عند اللہ بنا دیا تھا۔

۱ علم سے بے انتہا شغف

علوم نبوت سے آپ کو حد درجہ عشق تھا حصول علم میں آپ نے ناموافق حالات کے باوجود انتہائی جد و جہد فرمائی اور جابجا سفر فرما کر اپنے وقت کے اساطین امت سے اکتساب فیض کیا۔ اسی عشق نے آپ کو باندہ سے کانپور، پانی پت، مظاہر علوم، سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، ٹونک اور مظفرپور کے مراکز علم کی جادہ پیمائی پر مجبور کیا تھا، جس سے آپ کی ذات معقولات و منقولات کا سنگم بن گئی تھی اور تحصیل علم میں آپ نے اپنے اساتذہ کی نگاہ میں اتنا وقار حاصل کر لیا تھا کہ آپ کے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ اور استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ

لہ حضرت مفتی صاحبؒ کا مقولہ "النور" بانڈی پورہ کشمیر کے خاص نمبر قسط ۲ میں نقل کیا گیا ہے اور اس میں حضرت شاہ ابرار الحق صاحب کے بارے میں بھی حضرت مفتی صاحب کا یہی ارشاد درج ہے۔

فرماتے تھے کہ "قیامت میں اگر اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ کیا لے کر آئے تو ہم صدیق احمد کو پیش کر دیں گے"
فراغت کے بعد جب آپ نے اشاعتِ علم کے لئے اپنی ساری زندگی وقف فرما دی. مختلف اداروں میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد جب آپ نے ۱۳۷۱ھ میں خزینۃ العلوم کے نام سے اپنے وطن مالوف ہتھورا باندہ میں جامعہ عربیہ کی بنیاد رکھی تو آپ کے جذباتِ اشاعت علم عروج پر آنے لگے۔ بنجر علاقہ، جہالت کی آماجگاہ، جرائم اور خوف و دہشت کا ماحول۔ لیکن اس اللہ کے مخلص بندہ نے انہی جاں گسل حالات میں محض اللہ کے بھروسہ پر کام کا آغاز کیا۔ اور مسلمانوں کی مرتد شدہ نسلوں کو دوبارہ ایمان کی دولت سے مشرف کرانے لگا۔ کچے مکان اور کھپریل کے نیچے بیٹھ کر سالوں سال دین کے لئے محنتیں کیں۔ آس پاس کے دیہاتوں اور جنگل نما آبادیوں میں سفر کر کے مسلمان بچوں کو فراہم کرنے اور انھیں دینی علوم سے آراستہ کرنے میں اپنا خون پسینہ کھپاتے رہے۔ ایک مرتبہ خود دوران گفتگو ارشاد فرمایا کہ "یہ مدرسہ کچا تھا اور ضلع باندہ کی مٹی ایسی ہے جو برسات میں بہہ جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر سال دیواریں اور چھتیں گر جاتیں یا مخدوش ہو جاتیں تھیں۔ فرمایا کہ۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ برسات میں اندر کے حصے میں کیچڑ ہو جاتی اور طلبہ اور اساتذہ کھڑے کھڑے ہاتھ میں کتاب لئے پڑھتے پڑھاتے تھے"۔ فرمایا کہ "ادھر میری حالت آج بھی یہ ہے کہ اگر کسی سے اپنی ضرورت کیلئے کوئی لفظ بھی زبان سے نکل جاتا ہے تو مارے شرم کے پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے مدرسہ کے لئے مالیہ بھی زیادہ فراہم نہ ہو پاتا تھا۔ پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ یہی صورت پیش آئی تو میرا دل بھر آیا اور میں نے اپنے استاذ حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صورت حال لکھی۔ اس وقت حضرت مفتی صاحب کانپور میں اقامت پذیر تھے۔ انھوں نے میری ہمت افزائی فرماتے ہوئے پکی تعمیر کے لئے ایک معتد بہ رقم سر دست روانہ فرمائی اور یہ تاکید فرمائی کہ اب کام مت روکنا"۔ فرمایا کہ اس کے بعد سے مسلسل اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور ضرورت کے اسباب مہیا ہوتے چلے گئے۔ فالحمد للہ۔ آج یہ مدرسہ ملک کے مرکزی اداروں میں شمار ہوتا ہے اور ایک جہالت زدہ علاقہ میں علوم نبوت کی ضیاء پاشیاں کر رہا ہے یہ صرف حضرت قاری صاحب کے بے پایاں اخلاص و توکل اور علمی شغف کی برکت ہے۔ آخری زمانہ میں آپ کے اسفار حد سے زیادہ ہونے لگے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی آپ اپنے متعلقہ اسباق کا حتی الامکان ناغہ نہ ہونے دیتے تھے۔ اور کہیں جلسہ میں تشریف لے جاتے تو راتوں رات چلکر واپس تشریف لاتے اور آتے ہی سبق پڑھا دیتے۔ گذشتہ سال ہم لوگ باندہ حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ "میں طلبہ کے نقصان کا خیال کرتے ہوئے خود ہی سفر کرتا ہوں اور رات ہی میں واپس لوٹ آتا ہوں اگر اپنی جگہ کسی اور مدرس کو بھیج دوں تو وہ ایک جلسہ کے لئے ڈیڑھ دو دن کا ناغہ کریگا۔ میں صرف

اسباق کی پابندی کے لئے یہ مشقت اٹھاتا ہوں"۔ اس سے آپ کے بلند پایہ جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آپ آداب تعلیم و تعلم پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ اور ان پر نہ صرف یہ کہ خود عمل پیرا تھے بلکہ مدارس دینیہ سے وابستہ ہر فرد کو اس راستہ پر چلنے کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر آپ نے دو رسالے "آداب المتعلمین" اور "آداب المعلمین" کے نام سے تالیف فرمائے۔ جو اپنے موضوع پر نہایت مفید اور مقبول ہیں۔ علاوہ ازیں طلبہ کی ناقص استعدادوں کا خیال فرماتے ہوئے آپ نے تجوید، نحو، صرف اور منطق پر مختصر رسالے مرتب فرمائے اور منطق کی ادق کتاب سلم العلوم کی شرح لکھی جو دیگر شروحات کے مقابلہ میں آسان اور جامع ہے۔ اسی طرح شرح جامی کی مبسوط شرح تالیف فرمائی۔ اور اب آخری عمر میں ہوش ربا مصروفیات اور مسلسل اسفار کے دوران شرح تہذیب کی شرح تحریر فرمائی جو آپ کے بے انتہا علمی شغف کی آخری نشانی ہے۔ آپ عمر کے آخری لمحات تک تعلیم و تعلم ہی میں مشغول رہے۔ بدھ ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ کو ظہر کے بعد آپ نے سلم العلوم کا درس دیا اس کے بعد بخاری شریف کے درس کے لئے وضو فرما رہے تھے کہ مرض الوفات کا آغاز ہوا۔ گویا کہ باقاعدہ ہوش و حواس کے آخری لمحات آپ نے اپنی زندگی کے محبوب مشغلہ میں گذارے۔ اور جب طبیعت زیادہ بگڑنے پر آپ کو باندہ سے لکھنؤ لے جایا جانے لگا تو آپ نے آخری بات یہی ارشاد فرمائی کہ "مدرسہ کا خیال رکھنا اور طلبہ اور اساتذہ سے سلام کہنا"۔ خدا کرے کہ آپ کا لگایا ہوا یہ علمی گلشن ہمیشہ سرسبز اور شاداب رہے۔ اور آپ کے لئے بیش از بیش صدقہ جاریہ کا سامان فراہم ہوتا رہے آمین

۲۔ سادگی اور تواضع

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی کا نہایت تابناک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیوی تکلفات اور تصنع اور بناوٹ سے طبعی طور پر بالکل مستغنی کر دیا تھا۔ آپ کی ہر ہر ادا سے سادگی اور تواضع ٹپکتی تھی، کھانے پینے، لباس، ضروریات، ہر چیز میں سادگی اختیار فرماتے۔ عام طور پر سفر میں کالی دھاریوں والا معمولی سوتی رومال، کپڑے کا تھیلا جس میں ایک لوٹا، ایک لنگی اور ضرورت ہو تو ایک جوڑا کپڑا، بس یہی چیزیں ساتھ ہوتیں۔ حتیٰ کہ میرے ایک دوست نے جو افریقہ کے سفر میں حضرت قاری صاحب کے ساتھ بمبئی سے جوہانسبرگ گئے تھے بتایا کہ سفر افریقہ میں بھی حضرت قاری صاحبؒ کا کل سامان یہی کپڑے کا تھیلا تھا۔ بمبئی ایرپورٹ پر الوداع کہنے والے بعض احباب نے بہت زور دیا کہ حضرت کوئی بریف کیس لے لیں۔ لیکن حضرت نے قبول نہیں فرمایا۔ گذشتہ سال احقر نے ایک ٹوپی اور عربی رومال ہدیہ میں پیش کیا۔ تو ٹوپی تو قبول فرمائی۔

مگر وہ مال دیکھ کر فرمایا کہ "یہ تو آپ ہی کی شان کے لائق ہے"۔ اور قبول نہیں فرمایا۔ آپ دل سے اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے اور اپنے چھوٹوں سے بھی انتہائی اکرام اور احترام کا معاملہ فرماتے تھے۔ عام طور پر مقررین اور واعظین اپنے سامنے جلسہ میں کسی دوسرے کی تقریر پسند نہیں کرتے لیکن آپ کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ آپ تاکید کر کے اپنے سے قبل کسی دوسرے عالم کی تقریر کراتے اور نہایت غور سے اس کی باتیں سنتے۔ اور پھر عموماً اسی مضمون کو لے کر اپنا وعظ شروع فرما دیتے۔ مراد آباد اور اس کے اطراف میں حضرت قاری صاحبؒ کی تشریف آوری پر کئی پروگراموں میں اپنے وعظ سے قبل اس ناکارہ کو تقریر کا امر فرمایا۔ اور پھر ایک تقریر پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ آج تم نے وہی باتیں کہدیں جو میں کہنا چاہتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ صرف آپ کی توجہ کی برکت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خورد نوازی آپ کے کمال اخلاص اور تواضع کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں احقر کو بار بار دارالعلوم میں حضرت قاری صاحبؒ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جب آپ تشریف لاتے تو مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی اور آپ جدھر جاتے طلبہ کا ایک بڑا مجمع آپ کے ساتھ ہوتا۔ کئی مرتبہ طلبہ وغیرہ نے آپ سے دارالعلوم میں وعظ کی درخواست کی تو آپ نے ازراہ تواضع صاف انکار فرما دیا اور کہا کہ "جس جگہ اکابر نے وعظ کہا ہو وہاں میں وعظ نہیں کہہ سکتا"۔ اسی طرح ۱۹۹۵ء میں جب آپ مدرسہ شاہی میں رونق افروز ہوئے اور طلبہ دورۂ حدیث نے تبرکاً ایک سبق پڑھانے کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا "جس ادارے میں میں نے درس لیا ہے وہاں درس دینے کی ہمت نہیں ہے"۔ اسی بے مثال تواضع کا اثر یہ تھا کہ آپ کا قلب مبارک بغض وکینہ کے اثرات سے محفوظ تھا۔ آپ اپنے تمام اکابر و معاصرین سے تعلقات استوار رکھتے اور گروپ بندی سے اپنے آپ کو پوری طرح بچائے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شخصیت جماعتی اور مدارس کے اختلافات سے بلند تر تھی۔ اور آپ کی ذات کو ہر طبقہ میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔

۳۔ کمالِ زھد

حضرت قاری صاحب کا ایک ممتاز وصف آپ کا بے مثال زہد اور استغناء تھا۔ دنیا آپ کے قدموں میں ذلیل ہو کر آتی تھی لیکن آپ اسے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ مالداروں کی اصلاح کا جذبہ ضرور تھا لیکن ان کی دولت و ثروت سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ تھی۔ اسی استغناء نے آپ کو مقبولیت و محبوبیت کی بلندیوں تک پہونچا دیا تھا۔ اور آپ کی ذات حدیث نبوی ازھد فی الدنیا یحبك اللہ وازھد فیما عند الناس یحبك الناس (دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ عند اللہ محبوب بن جاؤ گے اور لوگوں کے مال و دولت سے اعراض کرنے لگو تو لوگوں کی نظر میں محبوب بن جاؤ گے) کی چلتی پھرتی تفسیر بن گئی تھی۔ آپ نے ساری دینی خدمات حسبۃً للہ انجام دیں۔ نہ صرف یہ کہ مدرسہ سے مشاہرہ نہ لیتے بلکہ اسفار میں بھی کرایہ کے علاوہ نذرانے وصول نہ فرماتے۔ اور کہیں کہیں تو اپنا ہی کرایہ خرچ کر کے تشریف لے جاتے۔ تمام مہمانوں کا صرفہ اپنے حساب سے ادا فرماتے۔ مدرسہ پر اس کا بوجھ نہ ڈالتے تھے۔

۴۔ عشقِ نبوی

علاوہ ازیں اتباع سنت میں بھی آپ کا قدم بہت راسخ تھا۔ معمولی سی معمولی سنت کی ادائگی کا بھی نہایت اہتمام فرماتے۔ گذشتہ سال ہم لوگ حاضر تھے۔ رات میں آرام فرمانے سے قبل آپ نے وضو فرمایا۔ پھر ارشاد فرمانے لگے: "اب اٹھتے بیٹھتے تکلیف ہوتی ہے۔ سوتے وقت وضو کا اہتمام دشوار ہوتا ہے لیکن بعض بزرگوں کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک رات باوضو سونے کے لئے انھیں ۱۴ مرتبہ وضو کرنا پڑا اور ہر مرتبہ پوری بشاشت سے وضو کرتے رہے تاکہ انھیں سنت کے موافق سونا نصیب ہو جائے۔ ایسے بزرگوں کے حالات سے عمل کی ہمت ہو جاتی ہے۔" آپ ہر عمل میں اتباع سنت کو ہی ملحوظ رکھتے۔ اور اسی نیت سے تمام امور انجام دیتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ جب کوئی عالم آپ سے ملنے حاضر ہوتا تو اس کو طلبہ میں بیان کرنے کا حکم فرماتے۔ ہم چند احباب حاضر ہوئے تو حسب معمول آپ نے تقریر کا پروگرام رکھا۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم تو استفادہ کے لئے حاضر ہوئے ہیں، افادہ کے لائق نہیں ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ "کیا مہمان کا اکرام سنت نہیں ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق آپ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی یہ عشقیہ جذبات الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر منظوم کلام کی شکل اختیار کر لیتے تو اس کے لفظ لفظ سے آپ کے سوز و گداز اور دردِ دل کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں آپ نے بڑی درد انگیز نعت ارشاد فرمائی جس کے چند بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دواؤں سے طبیعت رو بصحت ہے نہیں میری — طبیعت مضطرب ہے اب نہیں لگتی کہیں میری
نہیں سمجھا کوئی اس درد کو یہ درد کیسا ہے — دواؤں سے شفا ہرگز نہیں ہرگز نہیں میری
علاج اس کا فقط یہ ہے کہ طیبہ ہو نگاہوں میں — دیار قدس میں اشکوں سے تر ہو آستیں میری
متاعِ دردِ دل جو مل گئی مشکل سے ملتی ہے — خدا کا فضل ہے، حالت تو ایسی تھی نہیں میری
نہ دن میں چین ملتا ہے نہ شب میں نیند آتی ہے — سکوں باقی نہیں ہے خاطر اندوہگیں میری

وہ نقشہ جم گیا ہے اب تو دل میں ذات اقدس کا — تصور میں وہ رہتے ہیں نگاہیں ہوں کہیں میری
ہوا دیوانہ جب سے آپ کا خلوت میں رہتا ہوں — کسی سے بات کرنے کی کوئی خواہش نہیں میری

آپ کی دیگر نعتیں بھی انہی جذبات کی آئینہ دار ہیں جن میں سے بعض آپ کی تالیف "سیرت سید المرسلین" میں شائع ہو چکی ہیں۔

الغرض انہی خوبیوں کی وجہ سے خلق خدا آپ کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔ آپ کی آمد کی خبر سنکر گاؤں دیہات میں بھی ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا اور آپ کا سادہ اور تکلف سے خالی وعظ حاضرین پر اس قدر اثر انداز ہوتا کہ بڑی بڑی مرصع تقریروں سے بھی وہ بات حاصل نہیں ہو پاتی۔ آپ کی باتیں "از دل خیزد بر دل ریزد" (دل سے نکل کر دل تک پہونچنے) کا مصداق ہوتی تھیں۔ یہ آپ کی ظاہر و باطن کی یکسانیت اور علم و عمل میں مطابقت کا اثر تھا جسے ہر شخص محسوس کرتا تھا۔

آج حضرت قاری صاحبؒ کی ذات ہم میں گو کہ موجود نہیں مگر آپکی زندگی کے تابندہ نقوش ہمارے سامنے ہیں۔ ہماری نظر میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں سب سے بڑا اخراج عقیدت یہ ہے کہ ہم آپ کی زندگی کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور آپ کی بلند پایہ صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارا یہ عزم حضرت کی روح کو خوش کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ انشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔ اور حضرت مرحوم کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے آمین۔

عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ باندوی کی رحلت کے موقع پر

تاثرات

از: جناب علامہ منصورؔ بجنوری

اہلِ دل فخرِ وفا، اہل نظر جاتا رہا — اس جہاں سے آج مردِ مقتدر جاتا رہا
جس کی راتوں کو میسر تھا مناجاتوں کا نور — جس سے شرمندہ تھی قندیلِ سحر جاتا رہا
جس کی سانسوں پہ ہے لکھا مستجابُ الدعوات — کارزار بے اثر سے با اثر جاتا رہا
آج افسردہ ہے یوں ہی ملتِ اسلامیہ — دینِ احمد کے خزینے کا گہر جاتا رہا
جس کے ہر اک گام پر تھی رحمتوں کی بارشیں — اہل عالم کا وہ منظور نظر جاتا رہا
جو رہا بن کر شریعت اور طریقت کا امین — آج ایسا خضرِ منزل، راہبر جاتا رہا
جو سروں پر ایک مدت تک رہا جلوہ فگن — کیف پرور بار آور وہ شجر جاتا رہا
ہر کسی کے لب پہ ہے صدیق صاحبؒ باندوی — آہ سب کو چھوڑ کر با چشمِ تر جاتا رہا
اب کہاں منصورؔ ممکن ہے علاجِ دردِ دل — وہ مسیحا مرہم قلب و جگر جاتا رہا

پُر مشقت طالب علمی

اپنی ابتدائی طالب علمی کا یہ واقعہ بھی حضرت نے بارہا سنایا کہ میرے استاذ جو گاؤں کی مسجد میں مجھے حفظ کراتے تھے۔ صرف سات یا آٹھ پارے کے حافظ تھے۔ جب میں نے اتنے پارے حفظ کر لیے، تو فرمایا، "بیٹا اب تم کہیں باہر چلے جاؤ۔ ہم تو صرف اتنا ہی پڑھا سکتے تھے"۔ حضرت کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ مرحومہ نے کچھ کر کرا کے تھوڑا بہت انتظام کانپور جانے کا کر دیا۔ حضرت کے ساتھ کچھ خشک روٹیاں اور غالباً تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے بھی کر دیئے۔ کانپور کے کسی مدرسہ میں جاکر داخلہ لے لیا۔ مدرسہ سے کھانے کا انتظام ہوا نہیں یا حضرت نے لینا پسند نہیں کیا۔ یہ تفصیل مجھے یاد نہیں رہی۔ بہر حال کھانا مدرسہ سے نہیں ملتا تھا۔ کچھ دن تو ساتھ لائے ہوئے سامان پر گزارا کیا۔ جب وہ ختم ہو گیا۔ تو اللہ نے ایک وقت کے کھانے کا انتظام اس طرح کرا دیا کہ کانپور کے استاذ صاحب نے فرمایا۔ صدیق! تم ہمارے گھر سرکاری نل سے پانی بھر دیا کرو اور ایک وقت کا کھانا ہمارے یہاں سے لے لیا کرو۔ ان کا گھر بالائی منزل پر تھا۔ دو دو بالٹی لے کر زینہ پر چڑھنا پڑتا تھا۔ فرماتے تھے، بیچ زینہ میں کھڑے ہو کر رو لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا ملتا تھا۔ لیکن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب بننے کے لیے ابھی اور سخت تربیت اللہ کو منظور تھی۔ حضرت نے بارہا سنایا کہ ایک مہینہ بھی اس ایک وقت کے کھانے کے انتظام کو نہ ہوا تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک ساتھی حافظ نعمت اللہ صاحب میرے ساتھ پڑھنے کے لیے کانپور آگئے۔ اب صورت یہ تھی کہ ایک وقت کا کھانا اور دو آدمی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک ساتھی اور آگئے۔ اب چوبیس گھنٹے میں صرف ایک ایک چپاتی ہی حصہ میں آتی تھی۔ یہ نئے آنے والے ساتھی تو آزمائش

کو برداشت نہیں کر سکے اور جلد ہی وطن واپس چلے گئے ۔ لیکن حضرت اور جناب حافظ نعمت اللہ دونوں نے ایک سال پورا صرف ایک وقت کی ایک خوراک میں گذار دیا ۔[85]

(بروایت: مولانا محمد زکریا سنبھلی (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔ از پیغام محمود دیوبند)

اصلاحِ امت کی دھن

ضلع باندہ اور اس کے قرب و جوار میں کوئی قابل ذکر دینی ادارہ نہ تھا اور نہ کوئی شخصیت مدت سے دینی کام کرنے والی رہی تھی ۔ اس لئے اس علاقہ کا دینی حال بہت ہی خراب تھا ۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو صرف نام کے مسلمان تھے حقیقت اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا بلکہ بعض برادریاں تو اپنا تعارف اس طرح کراتی تھیں کہ ہم نہ ہندو ہیں، نہ مسلمان، ہم تو فلاں برادری سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آزادی کے بعد باندہ ضلع میں شدھی تحریک والوں نے کمزور مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا تھا اور ارتداد کا ایک سیلاب سا آگیا تھا ۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان یا تو واقعی مرتد ہو گئے تھے یا بالکل ارتداد کے قریب پہونچ گئے تھے ۔ حضرتؒ اس زمانہ میں فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں پڑھاتے تھے ۔ وہاں باندہ اور اس کے اطراف کی یہ خبریں پہونچتی رہتی تھیں خود سناتے تھے کہ ایک رات کو ۔ ۔ ۔ سونے کے ارادے سے جب لیٹا تو یہ خیال آگیا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہیں فرمائیں گے کہ تم نے یہ کتابیں پڑھائی تھیں کہ نہیں بلکہ مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے علاقہ میں ارتداد پھیل رہا تھا، لوگ مرتد ہو رہے تھے، تم نے کیا کیا؟ اس سوال کے ذہن میں آنے سے نیند غائب ہوگئی ۔ ساری رات اسی فکر میں ذہن غلطاں و پیچاں رہا اور ایک منٹ کو بھی نہ سو سکا ۔ لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی دل و دماغ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے علاقہ کے لوگوں میں کام کرنا ہے اور ان کے ایمان کی فکر کرنی ہے ۔ پھر اسی ارادہ سے اہل مدرسہ سے اجازت لیکر اپنے

یہاں چلا آیا ۔ شروع میں کام کی صورت یہ تھی کہ ایسے علاقوں کے دیہات میں جہاں ارتداد کی وبا عام ہو رہی تھی، حضرتؒ نے تن تنہا دورہ شروع کر دیا اور جہاں اور جیسے دین کی بات کرنے کا موقع ملتا، بات کرتے ۔ میں نے ابھی کچھ دن پہلے اس دورہ کی کچھ تفصیلات دریافت کی تھیں ۔ تو فرمایا کہ جو لوگ میرے گاؤں سے واقف تھے، ان سے ہتھوڑا کے حوالے سے تعارف کرا کر بات کرتا اور جو لوگ میری سسرال کے لوگوں سے واقف تھے ۔ ان سے ان لوگوں کے حوالہ سے بات شروع کرتا ۔ اسی طرح ایک دن میں کئی کئی دیہات گھوم پھر کر دین کی بات ان لوگوں کو پہونچایا کرتا تھا ۔ میرے سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا رات کا قیام کبھی کسی کھلیان میں، کبھی کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں بھی کرنا پڑتا تھا ۔ اس طرح کام کرتے ہوئے کئی مہینے گذر گئے تو محسوس ہوا کہ مدرسہ کی ضرورت ہے جسے اس کام کے مرکز کے طور پہ استعمال کیا جائے اور ان لوگوں کے بچوں کو وہاں پڑھانے کے لئے لے جایا جائے ۔ مدرسہ کی تجویز مولاناؒ نے باندہ اور قرب وجوار کے لوگوں کے پاس جا جا کر رکھی ۔ بعض حضرات سے بڑی امیدیں وابستہ کر کے ان کے پاس گئے لیکن اس کام کے نام سے ہی سب کانوں پر انگلیاں رکھ لیتے تھے ۔ لوگوں نے یہ تک کہا، صدیق! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم مدرسہ کی بات کرتے ہو ۔" اس سلسلہ کی تفصیلات حضرت بہت بتلایا کرتے تھے ۔ بہت سی ابھی تک میرے حافظہ میں محفوظ ہیں مگر بات بہت طویل ہو جائیگی ہر طرف سے مایوس ہو کر مولانا نے اپنے گاؤں میں مدرسہ کھول ہی دیا ۔ گاؤں والے سب بے حد غریب، کچے کچے مکانات، مسجد بھی چھوٹی اور خستہ ۔ مگر مولاناؒ کے عزم مصمم کے سامنے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہ رہی ۔ انہی دنوں حضرتؒ نے ایک طویل نظم کہی تھی ۔ جس کے کچھ اشعار حضرت نے مجھے کئی بار سنائے اور جب بھی سنائے آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں ۔ نظم کیا تھی ٹوٹے دل کی آہیں تھی ۔[86,87] (مولانا محمد زکریا سنبھلی پیغام محمود)

مدرسہ کی تعمیر میں شرکت

مدرسہ کے قریب ایک نالہ ہے۔ برسات میں اس کا پانی اپنے ساتھ چھوٹے کنکر بڑی مقدار میں بہا لاتا ہے وہ کنکر خاص خاص جگہوں پر نالے کے کنارے جمع ہوجاتے ہیں۔ پتھر کی تعمیر میں چونے کے ساتھ ملا کر یہ کنکر استعمال کیے جاتے ہیں۔ حضرت اس بات سے بہت واقف تھے کہ نالے کے کس کس موڑ پر کنکر زیادہ ملتے ہیں۔ پھر ان کو جمع کرنا اور دھونا بھی خوب جانتے تھے، طلبہ کو لے کر خود نالے پر تشریف لے جاتے، طلبہ کے ساتھ کنکر جمع کرتے۔ ان کو ٹوکریوں میں کر کے خود ڈھوتے اور بیل گاڑی پر لدوا کر لاتے تھے۔ حضرتؒ کے ساتھ کام کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ سب ہی لوگ حضرتؒ سے بے تکلف تھے بلکہ بعض طلبہ تو جو پرانے ہوچکے تھے۔ حضرتؒ سے چھیڑ چھاڑ بھی کرلیتے تھے۔ ایسا پیارا اور محبوب مربی نہ دیکھا، نہ سنا۔ لطیفے بھی ہوتے تھے۔ حضرت ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ ایسی حسین ہنسی اور اتنے خوبصورت دانت کم ہی دیکھے ہوں گے۔ تعمیر کے سلسلے میں سب لوگوں سے مشورے بھی لئے جاتے اور مشوروں کو قبول بھی فرماتے تھے، اس طرح تنکا تنکا کر کے یہ آشیانہ تعمیر ہوا ہے۔ اپنے مدرسہ کے علاوہ حضرتؒ کو بستی بستی قریہ قریہ مکاتب کے قیام کی بہت فکر رہتی تھی۔ (مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۸)

بے مثال تواضع

مولانا تواضع وانکساری کے پیکر تھے، اپنی ذات کو سب سے کمتر اور اپنے کو سب کا ادنیٰ خادم سمجھتے تھے۔ خدمت کے واقعات بہت سے پڑھے ہوں گے، یہ بھی پڑھ لیجئے۔ مدرسہ میں مسجد کے سامنے بارہ عدد بیت الخلاء بنے ہوتے تھے، جو طلبہ و اساتذہ کے بھی استعمال میں رہتے تھے۔ باندہ کے دیہاتی طلبہ جس جس طرح ان کو گندہ

کر سکتے تھے، کرتے تھے۔ لیکن صبح کے وقت سب بیت الخلاء روزانہ بالکل دھلے ہوئے ہوتے تھے۔ کسی کو دھونے والے کا پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک مرتبہ تقریباً ڈھائی بجے مجھے۔۔ بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب میں کسی قدر قریب پہونچا تو دیکھا کہ کوئی صاحب مسجد کے وضو خانے کا پانی جس گڈھے میں جمع ہوتا تھا اس سے بالٹی میں پانی لے کر بیت الخلاء دھو رہے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے حضرتؒ ہی ہیں۔ کہاں کا تقاضا، خاموشی سے۔۔۔ آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حضرتؒ کو یہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آگے بڑھ کر حضرتؒ کے ساتھ شریک ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ حضرت کو راز فاش ہوجانے پر افسوس ہوگا۔ اور حضرتؒ کو یہ سب کرتا دیکھ کر نیند کا کیا سوال۔ اس کام سے فارغ ہو کر مسجد کے قریب کنویں پر جو نل لگا تھا، وہاں جاکر غسل فرمایا۔ اور مسجد کے صحن میں تہجد کی نماز شروع کردی۔ اللہ ہی جان سکتا ہے کہ اس کے یہاں ان کاموں کا کیا اجر ملے گا۔ اور اس تہجد کی نماز پر اس کو کتنا پیار آتا ہوگا، اپنے کمرے کے سامنے صحن اور برآمدہ میں جھاڑو دے لینا تو کوئی بات ہی نہ تھی، یہ تو روزمرہ کا کام تھا۔

بہت ہی معزز مہمانوں کے لئے حضرتؒ کے کمرہ کے قریب دو بیت الخلاء بنے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک بہت محترم بزرگ آنے والے تھے کہ اس بیت الخلاء کا ٹینک بھر گیا۔ مولوی محمد منظور اور مولوی انیس احمد کو جو حضرت کے قریبی لوگوں میں ہیں بلایا، اور فرمایا ایک کام ہے، ہم ہی لوگ کر سکتے ہیں، بتلاؤ کرو گے؟ ان لوگوں نے عرض کیا ضرور۔ فرمایا یہ کام ہے۔ ان نوجوانوں کو بھی شاباش ہے کہ ان لوگوں نے حضرتؒ کے ساتھ یہ کام کیا۔ انہی دونوں کی روایت ہے، حضرت بھی بالٹیاں بھر کر غلاظت وہاں سے لے جاکر دور کھیت میں ڈال کر آتے تھے۔

(مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۸۸، ۸۹)

اپنے لئے احتیاط ہی پسند تھی

مولاناؒ کے یہاں اساتذہ کی تنخواہیں تو واقعی کم تھیں لیکن اور بہت سی سہولتیں ایسی تھیں جن سے تنخواہوں کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی۔ مثلاً اساتذہ کو مکانات بہت ہی کم کرایہ پر دیئے جاتے تھے اور حتی الوسع ہر خواہش مند استاذ کو مولاناؒ مکان فراہم کردیتے تھے۔ اسی طرح مطبخ کے لئے جو غلہ تیل وغیرہ فصل کے موقع پر خریدتے تھے، اس میں اساتذہ کے گھروں کے خرچ کا بھی لحاظ کرکے خریدتے تھے اور فصل کے موقع پر جس نرخ سے غلہ خریدا گیا تھا' اسی نرخ سے سال بھر اساتذہ کو دیتے رہتے تھے۔ یہ سامان قرض بھی دیا جاتا تھا۔ اور قیمت قسط وار تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔ رمضان المبارک سے پہلے شعبان میں رمضان کے خرچ کے لئے چاول، دال اور تیل وغیرہ مطبخ کے بند ہونے سے پہلے ہی دیدیا جاتا تھا۔ جس سال مولوی حبیب صاحب (حضرت کے بڑے صاحبزادے) مدرس ہوئے ہیں، اس سال شعبان کا واقعہ ہے۔ مطبخ کے ذمہ دار حضرات عام اساتذہ کو یہ سامان دے رہے تھے۔ مولوی حبیب صاحب اتفاقاً ادھر سے گذرے (اس وقت مطبخ اتنا اندر نہیں تھا۔) تو انھوں نے مولوی حبیب صاحب سے کہا۔ آپ کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیں، آپ بھی تو اب استاذ ہو گئے ہیں۔ مولوی حبیب صاحب نے ان کے کہنے پر دو تین کلو چنے کی دال قیمتہً لے لی۔ اور دال لے کر نکل رہے تھے اور ادھر سے حضرتؒ تشریف لے آئے۔ دریافت فرمایا کیا ہے؟ آواز میں کرختگی تھی۔ بیچارے مولوی صاحب تو گھبرا گئے، غالباً مطبخ کے ذمہ دار نے ان کی طرف سے عرض کیا۔ تین کلو دال نقد قیمت دے کر لی ہے۔ میں نے حضرتؒ کے غضب کا ایسا حال کبھی نہ دیکھا تھا۔ انتہائی سخت انداز میں مولوی حبیب احمد کو ڈانٹا اور فرمایا۔ تمھارے باپ کا

مال ہے۔؟ میں بھیک مانگ کر تمھارے لئے لاتا ہوں؟ میں فوراً پہونچ گیا اور عرض کیا: وہ بھی تو مدرس ہیں اور یہ سہولت تو سب ہی مدرسین کے لئے ہے۔ لیکن حضرت کا غضب کسی طرح کم نہ ہوا، ہم سب ہی لرز گئے۔ بیچارے مولوی حبیب صاحب کا تو برا حال تھا، کسی طرح مطبخ واپس گئے اور وہ دال واپس کی۔

اپنے اور اپنے اہل وعیال کے بارے میں حضرت کی احتیاط کا یہی حال تھا مدرسہ سے نہ کبھی تنخواہ لی، اور نہ کوئی سہولت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے مدرسہ سے حاصل کی۔ جس زمین میں مدرسہ بنا ہوا ہے۔ اس کا اکثر حصہ مولاناؒ کے اہل خاندان یا اعزہ کی ملکیت تھا۔ نیز جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا، وہ بھی حضرت ہی نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ مدرسہ کی رقم اس میں صرف نہ کی تھی۔ مدرسہ کے کاموں سے سفر کرنا ہوتا تھا۔ تب بھی حتی الوسع مدرسہ سے کرایہ نہ لیتے، اور سفر میں کوئی معمولی سی تجارت کر لیتے جس سے کرایہ نکل آتا۔ مدرسہ کے ایک استاذ مولانا سعد اللہ صاحب کی کرانہ کی دوکان تھی۔ کانپور تشریف لے جا رہے تھے، فرمانے لگے۔ مولوی سعد اللہ صاحب! بتلائیے، آپ کی دوکان کے لئے کانپور سے کیا لیتے آئیں؟ جس سے ہمارا کرایہ نکل آئے۔ مولانا سعد اللہ صاحب نے عرض کیا، حضرت سن لائٹ صابن یہیں باندہ میں اس قیمت کا ملتا ہے، کانپور میں آپکو اس سے کم قیمت کا مل جائے گا۔ آپ ایک پیٹی صابن لے آئیں، ہم لے لیں گے، آپ کا کرایہ نکل آئے گا۔ مولاناؒ کانپور سے واپسی میں ایک پیٹی سن لائٹ صابن لے آئے۔ اور مولانا سعد اللہ صاحب کو دیدیا۔ اس میں صابن کی قیمت اور مولانا کا کرایہ بھی نکل آیا اور چھ عدد سن لائٹ صابن بچ رہے۔ فرمایا یہ غریب طلباء کے کام آجائیں گے۔"

(مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۶، ۹۷)

مہمانوں کا اکرام

احادیث میں اکرام ضیف کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔ حضرتؒ کے یہاں اس کا اہتمام آخری حد تک تھا، مہمانوں کی آمد تو وقت بے وقت ہوتی ہی رہتی تھی، مولانا مہمانوں کو مدرسہ کے ذمہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اب اس کی صورت یہی تھی کہ اپنے گھر جو کچھ ہو یا ہو سکے وہ لے آئیں اور بعض بہت ہی قریبی عزیزوں کے گھروں سے کچھ لے آئیں۔ مولانا کا کمرہ جو دارالضیافت بھی تھا، اس میں ایک عدد المونیم کی سینی، چار عدد المونیم کے پیالے اور ایک کپڑا جس میں مختلف رنگوں کے کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے رکھا رہتا تھا۔ اگر بے وقت مہمان آتے، تو حضرت خود یہ مذکورہ سامان اٹھاتے اور چل دیتے اپنے گھر اور عزیزوں کے گھروں سے کھانا لانے کے لئے۔ جس جس کا گھر راستہ میں پڑ جاتا، آواز دیتے جاتے۔ اور ایک پیالہ پکڑاتے جاتے، صاحب خانہ اپنے گھر سے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا مدرسہ لے کر پہونچ جاتے۔ پھر حضرت اپنے گھر جاکر جو کچھ ملتا یا جلد انتظام ہو سکتا لے آتے۔ میں الحمدللہ مولاناؒ کے کسی حد تک قریب تھا، کبھی کبھی یہ کام میں نے بھی کیا۔ مگر بہت کم۔ گاؤں کے لوگوں کا میرے ساتھ بھی بہت محبت کا تعلق تھا۔ ایک دفعہ حضرتؒ کی عدم موجودگی میں بے وقت ایک مہمان آگئے۔ ایک بہت ہی قریبی دوست کے گھر جاکر میں نے بھی آواز لگادی، وہ گھر پہ نہ تھے۔ بچوں کے ذریعہ اپنی بات اندر تک پہونچادی کہ مہمان آگئے ہیں۔ ایک پیالہ سالن یا دال دیدیں۔ اللہ ان کی اہلیہ کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ انھوں نے بچے کے ذریعہ پوری پتیلی باہر بھیج دی کہ مہمانوں کو کھلادیں۔ جو بچ جائے واپس کر دیں۔ ابھی بچوں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس گاؤں کے لوگ مہمان نوازی میں بے مثال تھے۔ حضرتؒ گاؤں کے لوگوں کے احسانات کا جو مدرسہ کے ابتدائی زمانہ میں ان لوگوں نے کئے تھے، بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے، جیساکہ

ابھی عرض کیا کہ میں حضرتؒ کی اس سنت پر کبھی کبھی عمل کر لیا کرتا تھا۔ لیکن حضرتؒ کو یہ بات برداشت نہ تھی کہ میں کسی کے دروازہ پر جاکر اس طرح آواز لگاؤں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت کی کچھ طبیعت خراب تھی۔ گھر تشریف لے گئے تھے کہ بے وقت مہمان آگئے۔ میں نے یہ سوچا کہ حضرتؒ کو زحمت ہوگی۔ خود ہی کچھ انتظام کر لیا جائے، وہی سینی اور کٹورے لے کر چل دیا۔ کسی ذریعہ سے مہمانوں کا حضرتؒ کو علم ہوگیا۔ فوراً چلے آئے۔ ادھر میں مدرسہ سے نکل چکا تھا، راستہ میں ملاقات ہوگئی۔ حضرت کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور فرمایا۔ مولانا سب کام آپ سے کرا لیتا ہوں، یہ کام آپ سے نہیں کراؤں گا۔ پھر بڑے درد سے فرمایا یہ تو میرے نصیب ہی میں لکھا ہے۔ (مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۱)

دوسرے کی دل شکنی کا خیال

ایک مرتبہ حضرتؒ کو کانپور رکتے ہوئے لکھنؤ جانا تھا۔ بطور خادم احقر بھی ساتھ تھا۔ نماز فجر سے قبل پسنجر ٹرین سے سفر شروع ہوا، قریب گیارہ بجے کانپور پہونچے، تب تک ناشتہ چائے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لوگ آتے گئے ملاقات کا سلسلہ چلتا رہا، کسی نے خواہش کی کہ حضرت ہمارے گھر چلیں، ناشتہ کرلیں۔ حضرت انکار فرماتے، کسی نے کہا حضرت ناشتہ ہم یہیں لے آئیں۔ حضرت انکار فرماتے، میں بھوک سے بے تاب ہو رہا ہوں، کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ کانپور اسٹیشن سے قریب مسجد شترخانہ ہے، وہاں حضرت پہونچ گئے۔ لوگوں کا ہجوم واصرار بڑھتا رہا۔ حضرت نے لوگوں سے کہا کہ مجھے کچھ آرام کرنا ہے، آپ لوگ چلے جائیں۔ دو گھنٹہ بعد آئیں۔ لوگ چلے گئے۔ اوپر امام صاحب کے حجرے میں گئے۔ اس وقت امام صاحب نہیں تھے۔ صرف مؤذن صاحب مسجد میں تھے پانچ دس منٹ حضرت لیٹ گئے۔ پھر اٹھے۔ مؤذن صاحب سے کہا آپ اپنا ناشتہ دان

دیدیں۔ جیب سے پانچ روپے نکالے اور مجھ سے کہا لو یہ ناشتہ دان، یہ بھی راستہ ہے، اس سے باہر چلے جانا، تندوری روٹی، پاؤ کلو ٹماٹر اور دو پیاز کی ڈلی لے لینا۔ قریب ہی دوکانیں تھیں، تھوڑی ہی دیر میں لے کر حاضر ہوگیا، کہا چٹنی بناؤ، بنائی گئی۔ پھر روٹی کھائی گئی۔ تب سکون ہوا۔

پھر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئے۔ جب وقت ہوا دروازہ کھولا گیا۔ لوگ آتے اور خواہش کرتے کہ کھانا ہمارے یہاں کھالیں۔ حضرت فرماتے کہ ہم کھانے سے فارغ ہوگئے۔ اب خواہش نہیں ہے۔ "اللہ اکبر! میں سوچتا رہ گیا، یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہاں ایک نہیں سینکڑوں چاہنے والے ہیں۔ پھر یہ استغناء کا عالم۔ اس میں ایک پہلو تو اس نالائق کی تربیت کا تھا، دوسرا پہلو یہ کہ کسی چاہنے والے کی دل شکنی نہ ہو، حضرت اس کا بطور خاص ہر معاملہ میں خیال رکھتے تھے، چونکہ یہ سفر کسی کی دعوت پر نہیں تھا، کسی کی دعوت قبول کر لیتے، تو دوسرے کی دل شکنی ہو سکتی تھی۔ واللہ اعلم۔

(مولانا احمد عبداللہ قاسمی، پیغام محمود ۳۸)

حوصلہ افزائی

میں حضرت کے کمرے کے سامنے برآمدہ میں شرح وقایہ پڑھایا کرتا تھا کہ اچانک حضرتؒ تیزی کے ساتھ کمرہ سے باہر تشریف لائے۔ اور سب طلبہ کے سامنے میرے پڑھانے کی تعریف فرمانے لگے۔ اور فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس مشکل جگہ کو آپ کیسے حل کریں گے۔؟ واللہ کیا تعبیر آپ نے کی ہے۔ مولانا اسے قلمبند کر دیجئے۔ مولانا، میرے کام آئے گا۔ اور یہ جملہ بار بار دہراتے رہے۔ میں اب بھی جب کہ یہ باتیں لکھ رہا ہوں آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس مرد خدا کے احسانات کا نہ بدلہ ادا کر سکا ہوں، نہ کر سکوں گا۔

(مولانا محمد زکریا صاحب سنبھلی، پیغام محمود ۸۴)

اصلاح بین الناس کی فکر

اللہ کے بندوں میں باہمی محبت والفت اور اچھے تعلقات کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کے بالمقابل آپس کی لڑائی اور باہمی نزاع کو شریعت میں بہت ناپسند سمجھا گیا ہے۔ حضرتؒ کو اصلاح بین الناس کی بڑی فکر رہتی تھی۔ خصوصاً وہ لوگ جو دیندار کہے جاتے ہیں۔ یا کسی دینی جماعت یا ادارہ سے وابستہ ہیں، جن کا اختلاف نہ صرف دو شخصیتوں بلکہ گروہوں کا اختلاف ہوتا ہے، بلکہ اس کے نتائج بڑے دوررس اور بڑے مضر ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے حضرت بڑی کوششیں فرماتے اور جو کچھ بن پڑتا، اس سے گریز نہ کرتے۔

ایک مدرسہ کے دو استاذوں میں کچھ اختلاف ہوگیا اور بات کچھ حد سے متجاوز ہوگئی۔ حضرتؒ نے ان دونوں کے درمیان صلح کرنی چاہی۔ ان میں سے ایک تو راضی ہوگئے۔ لیکن دوسرے جن پر کچھ زیادتی ہوگئی تھی۔ کسی طرح راضی ہونے اور دوسرے کے معافی مانگنے پر بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضرت نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی۔ میں اور ایک صاحب اور وہاں موجود تھے۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو حضرتؒ نے اپنی ٹوپی اتاری اور ان کے قدموں پر ڈال دی۔ ہم لوگوں پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ اور مجلس میں ایک سکتہ سا سب کو ہوگیا۔ لیکن حضرت کے اس عمل نے اپنا کام کر دیا اور آخر ان کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ اور انھوں نے بھی حضرتؒ کے ارشاد کے مطابق مصالحت کر لی۔

اسی طرح کا واقعہ لکھنؤ کے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح وصفائی کرنے کے سلسلہ میں بھی پیش آیا اور جب کچھ پرجوش نوجوانوں کو مصالحت کے لئے حضرتؒ کسی طرح تیار نہ کر سکے تو آخر میں روتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے قدموں پر ڈال دی

اور نتیجہ یہاں بھی اچھا ہی نکلا اور الحمد للہ ایک خطرناک قسم کا خون خرابہ ٹل گیا۔ اس قسم کے واقعات حضرتؒ کی زندگی میں بار بار پیش آئے ہیں۔ اور ان کی کوششوں نے کتنے ہی مسلمان خاندانوں اور دینی اداروں کو ہلاکت و بربادی سے بچا لیا۔ میری نگاہوں نے ؎

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

کا مصداق حضرت سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ (مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۲)

ہدیہ سے بے نیازی

اگر کوئی صاحب حضرت والا کو تحفہ ہدیہ پیش کرتے، تو فرماتے کہ مجھے ضرورت نہیں ہے کسی ضرورتمند کو دیدو، قبول نہیں فرماتے۔ لیکن اگر کسی کا ہدیہ لینے میں اس کی اصلاح نظر آتی تو قبول فرما لیتے اور اسی سفر میں وہ تحفہ کسی دوسرے کو دیدیتے تھے' بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اس خاکسار نے بارہا دیکھا ہے کہ کافی موٹی موٹی رقم کے ہدیے پیش کئے جاتے تھے مگر نہایت بے نیازی سے مسترد فرماتے تھے۔ یہ خاکسار بھی بارہا بہت سے احباب کے ہدایا قبول کرنے کے لئے سفارش کردیا کرتا تھا۔ مگر قبول نہیں کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میں لے کر کروں گا کیا۔ ؟ کسی اور کو دیدو۔

(مولانا مفتی شبیر احمد صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد، ندائے شاہی اکتوبر ۹۷ء)

سفر خرچ

حضرت والا صرف واجبی کرایا لیتے تھے اس سے زائد نذرانہ نہیں لیتے تھے، کار سے سفر ہوتا تو صرف اس میں تیل ڈالنے کی اجازت ہوتی تھی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ بعض بعض لمبے سفر میں لوگ تیل بھی نہیں ڈالتے تھے۔ حضرت والا کی زندگی نہایت مسکنت

اور عزبت کی تھی۔۔ ایسی حالت میں اپنی جیب سے تیل ڈالنا ہوتا اور اپنے پیسے سے کرایہ اور ٹکٹ فراہم کرنا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ خاکسار سے فرمایا کہ مولوی شبیر! لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں بلا ٹکٹ سفر کرتا ہوں۔ (مولانا مفتی شبیر احمد صاحب، پیغام محمود ۱۴۱)

وقت کی قیمت کا احساس

دنیا میں ہر چیز کا بدل مل سکتا ہے لیکن وقت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کی تلافی ناممکن ہے۔ اور ہم لوگوں۔۔ میں سب سے زیادہ ناقدری کا شکار ہمارے اوقات ہی ہیں۔

مولاناؒ کے نزدیک اپنے وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی، وہ جن کاموں میں اپنے اوقات کو صرف کرتے تھے، ان کو دین سمجھ کر ہی اپنا وقت لگاتے تھے۔ مدرسہ میں بڑی بڑی اور مشکل کتابوں کے پڑھانے کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا انتظام بلکہ عملاً اس کے کاموں میں شرکت' مدرسہ کے مطبخ کی فکر' اور اس کے لئے بھی وقت خرچ کرنا، مہمانوں کی میزبانی' بلکہ ان کے لئے ہر طرح کے اکرام و راحت رسانی کی فکر اور روزانہ ہزاروں نہ سہی سینکڑوں کے اوسط سے تو یقیناً تعویذوں کا لکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا اپنے معمولات سفر و حضر میں نہ چھوڑتے تھے۔ بلکہ سفر میں تو تلاوت کا زیادہ ہی اہتمام فرماتے تھے۔

میں ایک بار بمبئی کے سفر میں ساتھ تھا۔ لکھنؤ سے یہ سفر ہوا تھا۔ کانپور میں کچھ حضرات ملنے کے لئے آئے، پھر جھانسی میں بھی کچھ لوگوں نے ملاقات کی۔ ضرورتمندوں کو بھی حضرتؒ کا پروگرام معلوم رہتا تھا۔ جھانسی سے رات کے دو بجے کے قریب گاڑی چلی تھی، مجھے دوبارہ نیند آگئی۔ لیکن حضرت تہجد میں مشغول ہوگئے۔ ۳ بجے آنکھ کھلی، تو

دیکھا کہ نماز سے فراغت کے بعد دعا و مناجات میں مشغول ہیں۔ بمبئی کا یہ سفر بمبئی کے بعد بھٹکل کرناٹک تک تھا۔ بھٹکل کے قریب انتہائی حسین وجمیل قدرتی مناظر ہیں۔ سفر کے دوران ان کو دیکھنے لگا اور ایک دو بار حضرت کو بھی متوجہ کیا، حضرت ایک لمحہ کے لئے توجہ فرماتے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ میں نے ایک بار مزید عرض کیا کہ حضرت دیکھئے تو کتنا حسین منظر ہے۔ حضرتؒ نے قدرے بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ ان کا کیا دیکھنا اور اپنے کام یعنی تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ (مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۹)

ترکِ مالایعنی

ایک مرتبہ بستی تشریف لائے میں حاضر خدمت ہوا، بستی سے کچھ دور ایک مدرسہ میں جانا تھا، ہم لوگ بھی ساتھ ہو لئے۔ مغرب کے بعد تھوڑی دیر ہمارے ساتھ چائے پانی کرتے رہے۔ اس کے بعد مجلسی گپ شپ کی جگہ سے وہ اٹھے اور سامنے کے دوسرے برآمدہ میں جاکر ایک مصلیٰ پر بیٹھ گئے اور تسبیح پڑھنے لگے، تب سمجھ میں آیا کہ فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابًا کا کیا مطلب ہے اور ذکرِ الٰہی کا کیا درجہ ہے اور اس کیلئے ترکِ مالایعنی کی کتنی ضرورت ہے۔ (مولانا افضال الحق قاسمی)
پیغام محمود ۹۹

ایثار کا عملی نمونہ

میرے حافظہ میں نہ جانے کتنے ہی واقعات پڑے ہیں، ایک واقعہ اور لکھتا ہوں۔ حضرتؒ کی بڑی صاحبزادی کی شادی کو کچھ ہی دن گذرے تھے، ان کی سسرال کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ غالبًا ان کو سسرال لے جانا تھا۔ ان حضرات کا قیام دو تین دن ہتھوڑا میں رہا۔ ان لوگوں کی کئی کئی رشتہ داریاں اس گاؤں میں تھیں۔ ایک دن ان لوگوں کا رات کا کھانا مولانا کے ایک قریبی عزیز کے یہاں تھا۔ عصر کے بعد اچھی خاصی

بارش ہوگئی اور گاؤں کے راستے خراب ہوگئے۔ جن صاحب کے یہاں دعوت تھی انھوں نے حضرتؒ کے گھر کھانا بھجوادیا اور کہلا دیا کہ مہمان ہمارے یہاں تشریف نہ لائیں، اس میں زحمت ہوگی، اللہ کا کرنا مغرب کے کچھ دیر بعد کانپور کے کئی مہمان اچانک مدرسہ میں پہونچے۔ حضرت کو ان کے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر جاکر کانپور کے ان مہمانوں کا ذکر کیا اور معلوم کیا کہ کھانے کو کچھ ہے۔؟ اہل خانہ نے پوری بات بتلادی اور یہ بھی کہ ہم لوگوں کی دعوت بھی چونکہ وہاں تھی۔ اس لئے ہمارے لئے بھی کھانا وہیں سے آیا ہے۔ گھر میں کچھ نہیں پکا ہے۔ حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ یہ کھانا مدرسہ بھیج دو اور تم لوگ کچھ دلیہ یا چاول وغیرہ پکالو، وہاں سے جو بچ جائے گا آجائیگا اور یہ ہی ہوا، گھر سے وہ کھانا آگیا، کانپور کے مہمانوں نے کھایا اور جو بچا وہ اپنے مہمانوں کو کھلایا۔ اپنے سمدھیانہ کے مہمانوں کے مقابلہ میں مدرسہ کے مہمانوں کو ترجیح دینا بڑا مشکل کام ہے۔ (مولانا محمد زکریا سنبھلی، پیغام محمود ۹۵)

لاوارثوں کی کفالت

ہمارے زمانہ میں ایک لاوارث باندہ کے تھے، حضرت ان کو مدرسہ میں لے آئے وہ بیمار رہتے تھے۔ اکثر لیٹے رہتے۔ حضرت سفر سے آکر فورًا ان کی خیریت معلوم کرتے اور ان کے لئے کچھ کھانے کی چیز لایا کرتے۔ ایک بار وہ بہت زیادہ بیمار ہوگئے، حالت ایسی ہوگئی کہ پائخانہ پیشاب تخت پر ہونے لگا۔ سارے کپڑے اور تخت سب بدبودار ہوگئے مکھیاں ہر وقت بیٹھی رہتی تھیں۔ کئی روز کے بعد حضرت سفر سے تشریف لائے، یہ حالت دیکھی، پہلے سارے اسباق پڑھائے۔ پھر ہماری جماعت کو لے کر ان کے تخت کو اٹھوایا ہم لوگوں سے پانی منگوایا اور حضرت نے خود ان کو اچھی طرح نہلایا، کپڑے صاف کرائے، تخت صاف کیا۔ اور بعد میں ہم لوگوں نے حضرت کے ساتھ جاکر تالاب پر غسل کیا۔

چند روز کے بعد ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ (بروایت مولانا عبدالجلیل صاحب مدرس شاہی)
(ندائے شاہی اکتوبر ۹۷ء)

یہ تو خیانت ہوگی

ایک دفعہ حضرتؒ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ کئی دن ہوگئے افاقہ نہیں ہو رہا تھا مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے قطعاً آرام کرنے کو نہیں ملتا۔ ہم لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت ایک دو دن گھر آرام کرلیں، تو جلدی افاقہ ہو جائے گا۔ پہلے تو انکار کرتے رہے۔ بہت اصرار کے بعد گھر چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ بعد نماز عشاء چند طلباء کے سہارے گھر تشریف لے گئے، خود سے چلنا بھی مشکل تھا۔ پھر ہم سب سو گئے۔ صبح ۳ بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ حضرت کے کمرہ کی بتی جل رہی ہے۔ قدیم گیٹ کے اوپر والے کمرے میں میرا قیام تھا۔ وہاں سے فوراً نیچے آیا دیکھتا کیا ہوں، حضرت بیٹھے ہیں، نہ جانے کب آگئے کیسے آگئے، ہاتھ میں شرح جامی ہے۔ سامنے تپائی پر کئی شروحات رکھی ہیں۔ مطالعہ میں مصروف، میں نے کہا حضرت آپ کب آئے؟ کیسے آئے؟ طبیعت تو رات میں کافی خراب تھی۔ ایک آدھ دن گھر پہ آرام ہی کرلیتے۔ تو حضرت فرمانے لگے کہ صبح سبق پڑھانا ہے، کیا بغیر مطالعہ کے سبق پڑھا دوں؟ یہ تو خیانت ہوگی۔ یہ تو خیانت ہوگی۔

(مولانا احمد عبداللہ قاسمی، پیغام محمود، ۳۹)

آخرت میں جواب دہی کا خوف

پھر دوسرے سال بھی ایک مرتبہ طبیعت کافی خراب ہوئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے بے ہوشی کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ ایسی حالت میں بھی اصرار ہے کہ کتابیں لاؤ، سبق پڑھاؤں گا۔ ہم طلباء نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت ویسے تو آپ کبھی چھٹی دیتے

نہیں، حتیٰ کہ جمعہ کے دن بھی آپ اپنے اسباق پڑھاتے ہیں۔ آج ہم طلباء کی خواہش ہے کہ اسباق نہ پڑھائیں۔ کہنے لگے کہ نہیں'۔۔۔ سبق پڑھاؤں گا۔ چند اساتذہ کرام سے کہلوایا کہ چھٹی کرالیں۔ وہ حضرت گئے، طلباء کی خواہش ظاہر کی۔ ناکام و نامراد واپس آئے۔ چار و ناچار کتابیں لے کر حضرتؒ کی خدمت میں پہونچ گئے۔ حضرت لیٹے تھے۔ جب طلباء بیٹھ گئے زار و قطار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے جیسے ایک بچہ روتا ہے۔ اور کہنے لگے بھائی میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ پڑھتے پڑھتے، پڑھاتے پڑھاتے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ میں کیسے کسی کی ریس کر سکتا ہوں۔ آپ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ میرے پاس امانت ہیں، اگر اس وقت میرا سفر ہو جائے، (موت آجائے) تو امانت میں خیانت کر کے خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کافی دیر تک روتے رہے۔ پھر کہنے لگے اللہ مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ آپنے لوگوں کے لئے کیا اور کیسے کھانے کا نظم کیا ہے اور کیسی رہائش مہیا کی ہے؛ ہاں تعلیم و تربیت میں مجھ سے کوتاہی ہوگی۔ تو ضرور ہی اللہ کے یہاں باز پرس ہوگی۔ اسی حالت میں لیٹے لیٹے چھ سات کتابوں کا سبق پڑھایا۔ اللہ اکبر کیا استحضار کا عالم کیا عجب شان تھی میرے حضرتؒ کی۔ (مولانا احمد عبداللہ قاسمی - پیغام محمود ۳۹، ۴۰)

قیامت کے دن تمہارا دامن پکڑونگا

ایک دفعہ دوران درس فرمانے لگے، دیکھو دنیا میں مرچ، ہلدی، دھنیا بیچنے والے تو بہت ہیں، دین کا کام کرنے والے بہت کم ہیں، خبردار یہاں سے جانے کے بعد دین کی خدمت میں لگے رہنا، مرچ، ہلدی، دھنیا نہ بیچنے لگنا۔ اگر تم لوگ بھی مرچ، ہلدی، دھنیا بیچنے میں مشغول ہوگئے تو یاد رکھنا، کل قیامت کے دن تمہارا دامن پکڑونگا۔

حضرتؒ کی توجہ اور فکر کا نتیجہ یہی ہے کہ جامعہ کے فارغین اور ہماری جماعت کے

سب طلباء جہاں تک مجھے علم ہے کسی نہ کسی درجہ میں دین کے کام سے جڑے ہوئے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور مرتے دم تک اخلاص کے ساتھ دین کے کام میں لگے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(مولانا احمد عبداللہ، پیغام محمود ۱۴)

میں نے آخرت کا بوجھ اوڑھ لیا ہے

میں نے مولاناؒ سے عرض کیا حضرت آپ کے احباب اور خدام آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں مگر آپ اتنا بڑا بوجھ اٹھا لیتے ہیں کہ لوگ ہمت ہار کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مگر آپ نہیں تھکتے۔ اور ہماری کام یکے بعد دیگرے برابر کرتے رہتے ہیں۔ تو حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ نے فرمایا۔ بھائی پریشانیاں سب کے ساتھ ہیں، خواہ امیر ہو یا غریب، ان سے کوئی خالی نہیں ہے۔ میں نے دنیا کا بوجھ اتار کر پھینک دیا ہے اور آخرت کا بوجھ اوڑھ لیا ہے یہ مجھ سے پوری زندگی جانے کا نہیں۔"

(مولانا محمد حسن باندوی، پیغام محمود ۱۷۸)

تربیت کا انوکھا انداز

مدارس دینیہ کی روح، نظام تعلیم، نظام تربیت و نصاب کامل ہے، ذمہ داران مدارس اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ تعلیم و تعلم میں تربیت کا بڑا عمل دخل ہے حضرت قاری صاحبؒ طلباء کے تربیت کے سلسلہ میں ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، طلباء عزیز کو لغو باتوں اور منکر کاموں سے سختی کے ساتھ شفقت کے انداز میں منع فرماتے رہتے تھے۔ اس کام کی دلچسپی کی وجہ سے سالہا سال سے حضرت کا یہ معمول تھا کہ جب جامعہ میں قیام رہتا، تو عشاء کی نماز کے بعد اجتماعی طو

ر سے طلباء سے نماز کی عملی مشق کراتے۔ مثلاً تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ کیا ہے۔ پھر اصلاح احوال کے لئے اخیر میں "تنبیہ الغافلین" کتاب پڑھ کر سمجھاتے۔ وقتاً فوقتاً اپنی طالب علمی کے حیرت انگیز واقعات اور اکابر کے مجاہدانہ کردار کو بیان فرماتے ہوئے طلباء کو عمل کے لئے ابھارتے تھے۔ کبھی کبھی ارشاد فرماتے کہ بھائی جن کا وضو ہو، وہ چار رکعت تہجد پڑھ کر کمرہ جائیں۔ میرے بھائی ابھی سے تہجد کی عادت ڈالو، پھر اخیر شب میں اٹھنا آسان ہو جائے گا۔ تہجد کی لذت و قدر محسوس ہو گی۔ یہی وہ گرانقدر انمول نصیحتیں تھیں۔ جن کو حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں طلباء اس غیر آباد وادی میں اپنا قیام فخر محسوس کرتے تھے۔ ؎

؎ نہ دولت سے مطلب، نہ زر ڈھونڈھتا ہوں
میں استاذ کی وہ نظر ڈھونڈھتا ہوں

(مولانا محمد عرفان بہرائچی مبلغ دار العلوم دیوبند، پیغام محمود ۲۴۳)

طلباء کیلئے گرانقدر نصیحت

دینی مدارس میں علم دین حاصل کرنے والے طلباء کا مقام و مرتبہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم مہمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو، لہذا اس نسبت کا ہر وقت خیال رکھو، ہر چیز، ہر کام میں سنت کو مقدم رکھو، تاکہ فرائض میں پختگی پیدا ہو۔

میرے بھائی کبھی مدرسہ کے نظام میں مداخلت نہ کرنا، جو طلباء مدارس کے نظام میں دخل اندازی کرتے ہیں اور ذمہ داران مدارس کو پریشان کرتے ہیں۔ آئے دن کھانے اور سونے پر ہنگامہ کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ کبھی دین کی خدمت میں نہیں لگتے بلکہ ان کی عمریوں ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ مدارس کے ذمہ داران کی قدر کرو کہ انھوں نے

تم کو کسب معاش سے یکسو کر دیا ہے۔ اب ایسی شکل میں نہ پڑھنا میرے بھائی بڑی محرومی کی بات ہے۔ فرماتے: مگر افسوس آج کل کے طلباء کھانے پہننے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ میرے بھائی! وقت کی قدر کرو۔ یہ لمحات پھر زندگی میں نہیں آئیں گے۔ ؎

؎ جو دانش کو خورشید تاباں بنا دے
میں استاذ کی وہ نظر ڈھونڈھتا ہوں

(مولانا محمد عرفان بہرائچیؒ، پیغام محمود ۲۴۳)

امورِ عشرہ برائے طلباء

۷۔ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ کی تاریخ تھی، رات کے دو بج رہے تھے۔ موسم سرد، راستہ نشیب و فراز، ماحول تنگ و تاریک، زمین ریگستان، یکایک لب سڑک ایک مدرسہ کی عمارت نظر آئی۔ مدرسہ کے اساتذہ، ملازمین، طلباء سڑک پر کھڑے لالٹین کی روشنی میں قطب وقت جنید زماں حضرت قاری صاحبؒ کی آمد کے منتظر تھے۔ سلام و کلام کے بعد مدرسہ کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ مختصر مگر اہم جامع ترین امورِ عشرہ برائے طلباء بیان فرمائے۔

خدا کی حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا، میرے بھائیو، دوستو، بزرگو، علیم و حکیم کی ہر بات ہر کام مبنی بر حکمت ہوتا ہے۔ اللہ پاک کا شکر ادا کرو کہ ہم کو اس دینی مدرسہ کے لئے خواہ تحصیل علم یا برائے تعلم قبول فرمایا۔

(۱) یہ دینی مدارس اسلامی روحانی شفاخانے ہیں، جس طرح مریض کے لئے حکیم ڈاکٹر کی ہر بات از راہ خیر خواہی ہوتی ہے۔ اسی طرح میرے عزیز طلباء تمھارے اساتذہ تمھارے لئے حکیم و ڈاکٹر سے زیادہ بھی خواہ ہیں، انکی ہر بات پر عمل کرو۔

(۲) مواقع کو غنیمت جانو وقت کی بے حد قدر کرو۔ اس وقت جو کچھ حاصل کر لوگے، وہی کام آئے گا۔

(۳) اساتذہ کرام کا احترام کرو، ان کو اپنے لئے شفیق سمجھو، ہر تنبیہ پر عمل کرو۔

(۴) کثرت مطالعہ کے عادی بنو، غیر متعلق کتب، اخبار بینی، غیر ضروری چیزوں سے اپنے کو الگ رکھو، خارجی اوقات میں اپنے اکابر کے حالات کا مطالعہ کرو، اس سے عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔

(۵) تحصیل علم کا مقصد نام نمود شہرت ہرگز ہرگز نہ ہو، بلکہ رضائے الٰہی کے طلبگار و خواستگار بنو۔

(۶) علم بغیر عمل کے بیکار ہے، اور علم کو محفوظ کرنے کا آسان نسخہ عمل ہے، عمل سے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

(۷) عوام و خواص کی خدمت کا جذبہ پیدا کرو، اس سے دنیا و آخرت میں ترقی ملیگی

(۸) نظام مدرسہ میں ہرگز مداخلت نہ کرو، یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔

(۹) تلاوت قرآن مجید، نماز باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کرو

(۱۰) اساتذہ کرام طلباء عزیز کو ان کے والدین کی امانت سمجھیں، حتی الامکان مارپیٹ سے احتیاط کریں۔ محبت و شفقت سے ان کی اصلاح کریں۔ ان کے پلے ضرور کچھ باندھیں۔

(مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچیؒ، پیغام محمود ۲۴۶)

سچی محبت کی نشانیاں

محمد سلمان
منصورپوری

دربار نبوت سجا ہوا ہے۔ پیغمبر دوجہاں سرور کائنات فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار صحابہ کے جھرمٹ میں اس طرح تشریف فرما ہیں جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں دمکتا ہوا چاند ہوتا ہے۔ صحابہ کی نظریں آقا علیہ السلام کے دیدار پُر انوار سے چکاچوند ہو رہی ہیں۔ ایک صحابی عبدالرحمٰن بن ابی قراد سلمی روایت کرتے ہیں کہ ایسے میں ایک مرتبہ آقا نے وضو فرمانے کا ارادہ کیا۔ پانی پیش کیا گیا۔ اب حضرتؐ وضو فرمانے کے لیے تشریف فرما ہو گئے ہم جیسا کوئی ہوتا تو وضو کرتا دیکھ کر دور ہٹ جاتا کہ کہیں پانی کی چھینٹیں نہ آجائیں۔ اور منہ کی کلی کا پانی کپڑوں پر نہ پڑ جائے۔ مگر وہاں تو منظر ہی عجیب تھا۔ آقا وضو فرمانے بیٹھے اور جاں نثاروں نے آپ کے گرد حلقہ بنانا شروع کر دیا۔ مجمع لگنا شروع ہو گیا۔ ہر ایک کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ کاش آقا کے وضو کا پانی زمین پر گرنے کے بجائے اس کے ہاتھوں پر گرے اور وہ اس پانی کو تبرک کے بطور چہرے اور بدن پر لگا کے سینے کی دھڑکن بنالے۔ حضور علیہ السلام کے جسد اطہر سے مس کر کے گرنے والے پانی کا قطرہ ان حقیقی عاشقوں کی نظر میں محض پانی کا قطرہ نہیں بلکہ اس گوہر نایاب کی جگہ میں تھا جس کی قیمت ساری دنیا کی دولتوں سے بھی نہیں لگائی جاسکتی اور ان جاں نثاروں کا آپ علیہ السلام کے وضو کے پانی اور لعاب دہن وغیرہ کے متعلق یہ سچے جذبات کوئی ایک دو دن کے واقعات نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے پوری زندگی اسی عشق و محبت کا ثبوت دیا ہے

الغرض عبدالرحمٰن بن ابی قرادؓ فرماتے ہیں کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضو فرمانا شروع کر دیا اور حضرات صحابہؓ وضو کے پانی کے قطرات کو ہاتھوں میں لینے لگے۔ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم توضا یوما فجعل اصحابہ یتمسحون بوضوئہ۔ یہ منظر دیکھ کر کسی کچے پکے آدمی کے دل میں عجب پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمارے مرید ہمارے کتنے عقیدتمند ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سرچشمہ ہدایت تھی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مربیٔ امت بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے محض صحابہؓ کے اس عمل پر نہ تو زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور نہ ہی اس پر اکتفا فرمانے کی تلقین کی۔ بلکہ سوال کیا مایحملکم علی ھذا۔ تمھیں اس عمل پر کس چیز نے آمادہ کیا۔ حضرات صحابہؓ نے جو کچی بات تھی وہ عرض کر دی کہ حبُّ اللّٰہِ ورسُولہٖ، یعنی ہمارے اس عمل کا منشا محبت خدا و رسولؐ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ گویا کہ یہ عمل ہماری اس دلی محبت کا آئینہ دار ہے جس سے ہمارے بدن کا رواں رواں سرشار ہے اور ہمارے پاس اپنی زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کے اس جواب پر سکوت نہیں فرمایا بلکہ ان کے توسط سے امت مرحومہ کو ایسی عظیم نصیحتیں فرمائیں جو ابد تک کے لیے واقعی مشعل راہ بن گئیں۔ آپ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا۔

من سرہ ان یحب اللّٰہ ورسولہ او یحبہ اللّٰہ ورسولہ فلیصدق فی حدیثہ اذا احدث ولیؤد امانتہ اذا اؤتمن ولیحسن جوار من جاورہ، (مشکوٰۃ ۲/۴۲۴)	جسے یہ پسند خاطر ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے یا وہ خدا اور اس کے رسول کا محبوب بن جائے تو وہ ۱ جب بولے سچ بولے۔ ۲ اور جب اسے امین بنایا جائے تو اپنی امانت ادا کرے۔ ۳ اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ محبت میں صرف زبانی جمع خرچ اور دنیا کی رسموں کا دراصل اعتبار نہیں بلکہ حقیقی محبت اور محبوبیت کا مقام حاصل کرنے کے لیے تین کام کرنے ضروری ہیں؛

۱ سچ بولنا یعنی زبان کو جھوٹ اور اس کے شائبہ سے محفوظ رکھنا۔ اسی طرح زبان سے صادر ہونے والے تمام گناہوں، غیبت، چغلی گالم گلوج وغیرہ سے بچتے رہنا، قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں زبان کی حفاظت کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس لئے محبت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان کو قابو میں رکھے۔ سچائی اختیار کئے بغیر محبت کا حق ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کو آپ دیکھیں کہ وہ محبت کا دعویٰ تو خوب کرتا ہے مگر اس کی زبان جھوٹ بولنے اور دیگر زبان کے معاصی سے محفوظ نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہے۔

۲ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی دوسری نشانی یہ بیان فرمائی کہ آدمی اپنی امانت کو پوری طرح ادا کرے۔ یہ امانت خواہ کسی شخص نے محسوس طور پر رکھوائی ہو اس کی بھی پوری طرح ادائیگی ضروری ہے۔ اسی طرح جو ذمہ داریاں انسان پر اللہ رب العزت یا بندوں کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں۔ وہ سب بھی امانت ہیں۔ ان کی بھی مکمل ادائیگی محبت خدا و رسول کا اہم تقاضا ہے۔ نمازوں کی ادائیگی، زکوٰۃ کا اہتمام، روزوں کی پابندی اور استطاعت کے وقت حج کے فریضہ سے سبکدوشی یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں

کی ادائیگی کی مثالیں ہیں۔ جبکہ زوجین کا ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنا والدین اور اولاد کے باہمی حقوق کی رعایت۔ مالک و ملازم کے باہمی حقوق، عوامی ذمہ داریاں، انجمنوں، دینی اداروں، مساجد و مدارس وغیرہ کے انتظامی امور، یہ سب بندوں کی امانتوں کے قبیل سے ہیں جن کی ادائیگی کامل طور پر لازم اور ضروری ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر محبت میں کمال حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

آج جو لوگ جلسوں اور عام مجلسوں میں محبت رسول اور محبت خدا کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے۔ انہی کی زندگی کتنے حقوق کے بوجھ میں دبی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ آج ہر شخص عموماً صرف اپنا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ مالک یہ سوچتا ہے کہ ملازم کا جتنا استحصال کر لیا جائے اچھا ہے۔ ملازم اس فکر میں رہتا ہے کہ ڈیوٹی پوری ہو یا نہ ہو مجھے پوری سہولیات ملنی چاہئیں۔ الغرض ہر طرف مفاد پرستی کا رجحان غالب ہے۔ یہ صورتحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ارشاد کے مطابق محبت کے تقاضے کے منافی ہے۔ اگر ہم سچے محب رسول ہیں اور محب خدا بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے۔

۳۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ یہ حکم بھی اگرچہ امانت کی ادائیگی کے ضمن میں معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اہتمام کی بنیاد پر الگ سے ذکر فرمایا۔ اس معاملہ میں بھی آج ہمارے معاشرہ میں کوتاہی عام ہے۔ کچھ مزاج اس طرح کا ہو گیا ہے کہ سارے شہر والوں سے دوستی ہو جائے گی لیکن اپنے پڑوسی سے کچھ نہ کچھ تنازعہ ہر جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اور پڑوسی ہی پڑوسی کی بدخواہی میں لگے رہتے ہیں۔ محلہ میں کسی کو کوئی نعمت نصیب ہو جائے تو آس پاس کے لوگ خواہ مخواہ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی شکایت کا بازار گرم رہتا ہے۔ اچھے اچھے دیندار لوگ بھی اس معاملہ میں لاپرواہی کرتے نظر آتے ہیں۔ محض پرنالے اور نالی نکالنے کے معاملے پر سالہا سال مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ یہ چیزیں انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھنا۔ دکھ درد میں شریک رہنا شریف لوگوں کا شیوہ ہے۔ اور محبت رسول و خدا کی عظیم نشانی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے اندر عفو و درگذر کا جذبہ پیدا کر کے سچے عشق و محبت کے مقام تک پہونچنے کی سعی کرنی چاہئے۔